تبصرۂ کتب

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006
اقبال اکادمی پاکستان

425

426

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک!
(اقبال)

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
اقبال اکادمی پاکستان
©2002-2006

حیاتِ جاوداں

تبصرہ : ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

حیاتِ جاوداں مرتبہ: محمد عبداللہ قریشی ، طبع اوّل، مئی ۱۹۸۷ء

ناشر: بزمِ اقبال، کلب روڈ ، لاہور ۔ صفحات ۱۶۸ قیمت : ۲۰ روپے ، مجلّد، ٹائپ، کاغذ عمدہ سفید ۔

شعر میں کسی واقعے یا حادثے وغیرہ کی تاریخ کہنا، جسے ادبی اصطلاح میں تاریخ گوئی کہا جاتا ہے، خاصا مشکل و ادق فن ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہے اور اثر انگیز بھی ۔ جس میں مہارت بہم پہنچانے کے لیے وسیع مطالعے اور مشق کی ضرورت ہے ۔ بہت کم شعراء نے اس فن میں دلچسپی لی ہے ۔ جن چند ایک نے اس طرف توجہ کی ہے، ان کی شہرت کا زیادہ تر دارومدار اسی فن پر ہے ۔ اور اب تو، جیسا کہ کتاب زیرِ تبصرہ کے فاضل مرتّب کا خیال ہے، "قدیم روایات کے ساتھ ساتھ تاریخ گوئی کا بازار بھی سرد پڑتا جا رہا ہے ۔ بہرحال "حیاتِ جاوداں" اسی مٹتے ہوئے فن کے حوالے سے ایک مختصر کتاب ہے جس کا تعلق حضرت علامہ سے ہے ۔ اور اس کے مرتب ہیں مشہور اقبال شناس محمد عبداللہ قریشی صاحب ۔

قریشی صاحب نے اپنی بیشتر کتابوں میں حضرت علامہ سے متعلق نئے یا فراموش شدہ گوشوں ہی کی نقاب کشائی کی ہے، اور یہ کتاب بھی ایک ایسے ہی گوشے کی نقاب کشائی کرتی ہے ۔ علامہ نے شاعری برائے شاعری نہیں کی، ان کے پیشِ نظر ایک خاص مقصد اور پیغام تھا، لہٰذا تاریخ گوئی کے "جھنجھٹ میں پڑ کر وہ اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے ۔" چنانچہ اس ضمن میں بعض لوگوں کے اصرار پر انہیں یہ کہنا پڑا :

تو گفتی از حیاتِ جاوداں گوی	بہ گوشِ مُردہ پیغامِ جاں گوی
ولے گویند این ناحق شناساں	کہ تاریخِ وفاتِ این و آں گوی

(تیرا کہنا ہے کہ حیاتِ جاوداں کی بات کر، ایک مُردے (بے جان قوم) کے کان میں زندگی کا پیغام سُنا۔

لیکن حق کو نہ پہچاننے والے یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ فلاں فلاں کی تاریخِ وفات کہہ۔)

تاہم کچھ ایسے واقعات وحادثات بھی وقوع پذیر ہو جاتے ہیں جو اپنا تاثر، ایسے شاعر پر، تاریخ گوئی کی صورت میں چھوڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت علامہ کے یہاں بھی چند ایسی تاریخیں ملتی ہیں جو یا تو انہوں نے کسی واقعے سے متاثر ہو کر بے ساختہ کہی ہیں، جیسے فتح سمرنا، اپنے والد بزرگوار، اپنے اساتذۂ کرام اور اپنی بیگمات وغیرہ کی جدائی پر یا ویسے ہی قلم برداشتہ آ گئی ہیں۔

کتاب زیرِ تبصرہ، جس کا نام یقیناً علامہ کی مذکورہ بالا رباعی سے ماخوذ ہے، لیکن فاضل مرتب نے اس سے ایک دوسرا اور برمحل مفہوم لیا ہے۔ مقدمے کے علاوہ اکتیس[۳۱] تاریخوں[۱ه] اور چھ نوحوں کو محیط ہے۔ مقدمے میں فاضل مرتب نے فنِ تاریخ گوئی کا مختصر سا تعارف کرایا ہے اور اس فن کی پیچیدگی کے ساتھ ساتھ اس کا زوال پذیری کا ذکر کرتے ہوئے بحث کا رخ علامہ کی تاریخ گوئی کی طرف موڑ دیا ہے۔ ان کے مطابق "اقبال کسی کے مجبور کرنے پر تاریخیں کم ہی کہتے ہیں۔ وہ اس معاملے میں فرمائشوں کے قائل ہی نہ تھے" (ص ۱۳)۔ انہوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے اور بجا کیا ہے کہ علامہ کے فکر و فن پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اور ابھی اور لکھی جائیں گی، لیکن "ان کی تاریخ گوئی اور تاریخی کاوشوں کا دقیق نظر سے ابھی تک مطالعہ نہیں کیا گیا۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ ایک دو کے سوا کسی نے اس صنف کو ان کے کمال کے اعتراف میں شمار کرنا بھی ضروری خیال نہیں کیا" (۱۴، ۱۵)۔ فاضل مرتب کی یہ بات خاصی لائقِ توجہ ہے کہ "بہت کم لوگ ایسے ہیں جو یہ بھی جانتے ہیں کہ اقبال کو اس فن میں درک حاصل تھا، اور جہاں وہ ایک عظیم شاعر، فلسفی اور مفکر تھے، وہاں وہ ایک نکتہ رس اور کامیاب تاریخ گو بھی تھے" (۱۵)۔ جناب قریشی نے حضرت علامہ کی اُن منتشر تاریخوں کو کس طرح جمع کیا اور اس سلسلے میں انہیں کس قدر زحمت اٹھانا اور بھاگ دوڑ کرنا پڑی، اس کا مختصر ذکر مقدمے میں آ گیا ہے جس سے جناب قریشی کی حضرت علامہ سے انتہائی وابستگی اور اپنے کام سے دلی لگن کا پتہ چلتا ہے۔ دیکھنے میں یہ کام جتنا مختصر نظر آتا ہے، اتنا ہی، محققین اور نقادوں کی اس طرف عدم توجہی کے سبب، خاصا کٹھن اور محال بن چکا تھا جسے کوئی دیوانہ ہی انجام دے سکتا تھا، اور قریشی صاحب سے بڑھ کر، اس معاملے میں، دیوانہ اور کون ہوگا! بلاشبہ ان کے اس کام پر منہ سے بے ساختہ تحسین و آفرین کے کلمات نکل جاتے ہیں۔ انہوں نے اس موضوع سے متعلق بعض مضامین کا بھی ذکر کیا ہے جو انہی کے

ایما پر اور انہی کے مہیا کردہ مواد کے حوالے سے حفیظ ہوشیارپوری مرحوم اور کسریٰ منہاس صاحب نے لکھے، لیکن ان میں (بالخصوص موخّر الذکر کے مضمون میں) چند ایک غلطیاں آجانے سے اور بعض دیگر وجوہ کی بنا پر ان کا "منصوبہ خاک میں مل گیا" (۱۱)۔ تاہم انہوں نے چالیس برس پہلے جو کام شروع کیا تھا، وہ کئی رکاوٹوں کے باوجود اب پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے، اور جو توقع ہے اگر ایک طرف اقبالیات کے قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا تو دوسری طرف اس موضوع پر مزید کام کرنے والوں کے لیے ایک رہنما خطوط ثابت ہوگا۔

مقدمے کے بعد مختلف واقعات و حادثات اور کتب و شخصیات وغیرہ سے متعلق تاریخیں ہیں۔ تاریخیں ترتیب زمانی کے مطابق ہیں اور ہر تاریخ سے پہلے متعلقہ تتمے یا شخصیت کا مختصر سا اور شگفتہ انداز میں تعارف ہے۔ سب سے پہلی تاریخ جو ۱۸۹۶ء میں کہی گئی، علم عروض سے متعلق ایک کتاب "مختصر العروض" کے لیے کہی گئی ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ علامہ اس وقت بی۔ اے کے طالب علم تھے۔ ۱۱ اشعار پر مشتمل یہ قطعہ جہاں ان کی اس زمانے میں بھی شعر گوئی پر زبردست گرفت کا پتہ دیتا ہے، وہاں تاریخ گوئی میں بھی ان کی مہارت و مشاقی کی نشان دہی کرتا ہے، اور یہ کہ اسی وقت سے فارسی شعر کے اساتذہ کا کلام ان کے مطالعے میں تھا۔ اور جیسا کہ فاضل مرتب نے لکھا ہے، یہ تاریخ اگرچہ علامہ کی ابتدائی مشق کا نتیجہ ہے، لیکن اس میں ایسی صنعت رکھی گئی ہے جو بڑی مشکل اور استادانہ ہے اور جس کا مظاہرہ فنی مہارت کے بغیر نہیں کیا جا سکتا (۱۲)۔ قطعے کے آخری دو شعروں میں تاریخ ہے۔ درمیان کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؂

صدائے نالۂ دل غیرتِ نظر فغانی ہے | مگر شور فغاں بلبل نے موزوں کر لیا اپنا
حسیں بیٹھے جو اپنا مصرع گیسو بنانے کو | رسالہ آپ کا آئینہ بن کر سامنے آیا

ایک اور بات جو دلچسپ بھی ہے اور حیران کن بھی، یہ ہے کہ علامہ کو شروع ہی سے قرآن کریم کے ساتھ زبردست وابستگی تھی، اور اسی بنا پر انہوں نے اس کا گہرا مطالعہ کیا جس کا گہرا عکس ہمیں ان تاریخوں میں نظر آتا ہے جو انہوں نے قرآنی آیات سے نکالیں، اور ان کی بیشتر تاریخیں قرآن کریم ہی سے ماخوذ ہیں۔ اس سلسلے کی ان کی پہلی تاریخ، کہ وہ بھی ان کے طالب علمی (ایم۔ اے) کے زمانے کی ہے، سرسید مرحوم کی وفات (۱۸۹۸ء) سے متعلق ہے: اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُکَ (۱۳۱۵ھ)۔ یہ سورۂ آلِ عمران کی اس آیت میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ارشاد خداوندی ہے۔ فاضل مرتب لکھتے ہیں "سرسید قوم میں بیداری پیدا کر کے مسیحا ثابت ہو چکے تھے ان پر کفر کے فتوے بھی

لگ چکے تھے۔ یہ آیت ان کی زندگی اور کارناموں پر پوری طرح صادق آتی تھی۔ اس سے اقبال کی قرآن فہمی، ذہانت اور تاریخ گوئی کے فن سے ان کی مکمل واقفیت کا ثبوت بھی ملتا ہے" (۲۸)۔ اس تاریخ کو بڑی شہرت ملی اور سرسید کی لوحِ مزار پر کندہ کرانے کے لیے، دوسری تاریخوں کے مقابلے میں اسے ہی موزوں سمجھا گیا۔ اسی طرح اردو کے مشہور شاعر امیر مینائی کی وفات (۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء) کے موقع پر کہی گئی دو تین تاریخوں میں ایک قرآن سے ماخوذ ہے "لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ" (سورۃ الشعراء) جسے بقول مرتب بے نظیر الہامی یادگار سمجھا جا سکتا ہے۔ مشہور مستشرق براؤن کی تاریخ وفات "ذالک الفوز العظیم" (۱۹۲۶ء) سے نکالی گئی ہے۔

علامہ نے اردو کے علاوہ فارسی اشعار میں بھی کئی تاریخیں کہی ہیں۔ ان میں بھی انھوں نے کہیں کہیں آیاتِ قرآنی سے استفادہ کیا ہے۔ مثلاً ۱۹۲۱ء میں مسجد سید علی ہجویریؒ کی ازسرِنو تعمیر ہوئی۔ مسجد کے دروازے پر علامہ کا دو شعری فارسی قطعۂ تاریخ کندہ کروایا گیا جس کے دوسرے شعر کے دونوں مصرعوں میں تاریخ ہے۔ "المسجد الاقصیٰ" اور "الذی بارکنا"۔ ایک اور تاریخ حدیثِ پاک سے بھی ماخوذ ہے۔ یہ علامہ نے اپنی لدھیانے والی بیگم کے حالتِ زچگی میں وفات پا جانے پر کہی تھی (۱۱۲)

غرض اس مختصر سی کتاب میں حضرت علامہ کی شاعری کے ایک فراموش شدہ باب ہی کو پھر سے واہی نہیں کیا گیا بلکہ بعض اہم واقعات کے ساتھ ساتھ کئی ایک دلچسپ علمی و ادبی اور شخصی گوشوں کو بھی سامنے لایا گیا ہے جن کی اپنی ایک اہمیت و افادیت ہے۔ قریشی صاحب نے بڑے ہی دلکش اور شگفتہ انداز میں متعلقہ شخصیات وغیرہ کا تعارف کرایا ہے جس کی بنا پر قاری شروع سے آخر تک کہیں بھی بوریت کا شکار نہیں ہوتا۔ جہاں جہاں تاریخ نکالنے میں کوئی فنی مجبوری یا غلطی آئی ہے، وہاں انھوں نے دلائل کے ساتھ اس کی توجیہ پیش کی ہے جو ان کی اس فن سے مناسب واقفیت کی غماز ہے۔ مقدمے میں انھوں نے تاریخ نکالنے کے مختلف طریقوں کا ذکر کرتے ہوئے بعض اصطلاحات کی بات کی ہے، مثلاً: تعمیہ، تخرجہ، اجمال وغیرہ (۱۲۰۱۱)۔ اگر وہ ان اصطلاحات کی تعریف و توضیح بھی کر دیتے تو کتاب مزید دلچسپی کی حامل ہوتی۔ لیکن شاید انھوں نے کتاب کو مختصر رکھنے کی خاطر، دانستہ اس طرف توجہ نہیں کی۔

کتاب کے آخر میں جو چند نوحے دیے گئے ہیں، ان کا تعلق تاریخ گوئی سے تو نہیں ہے، تاہم کتاب کے نام کے حوالے سے ان کی اس میں شمولیت کا جواز بنتا ہے، اور اس کی طرف فاضل مرتب نے شروع میں اشارہ کر دیا ہے (۱۴۷)۔ ان میں سے چار تو ایسے ہیں۔ ماتم پسر ۱۹۰۲ء، اکبر الٰہ آبادی

۱۹۲۱ء، شیخ غلام قادر گرامی اور مولانا محمد علی جوہر — جو حضرت علامہ کی یادگار ہونے کے باوجود مروجہ مجموعوں میں کسی وجہ سے جگہ نہ پا سکے" (۱۴۰) ۔ فاضل مرتب نے انہیں محفوظ کر کے عشاقِ اقبال پر بلاشبہ احسان کیا ہے ۔

کسی بھی کتاب کا مکمل صحت کے ساتھ طبع ہونا ، ایک محال امر ہے ، لہٰذا یہاں جن چند ایک اغلاط کی نشان دہی کی گئی ہے ، وہ محض اس خاطر ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں ان کی تکرار نہ ہو (خاص طور پر اشعار اور سنین کی اغلاط کی) : ص ۱۳۱ : ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک ، صحیح یقیناً ۱۹۳۱ ... ۔ ۔ ۔ ۔ ہے ۔ ص ۳۳ سطر ۱۳ (شعر) صباحے امیر ، صحیح صہبائے امیر ، ص ۳۸ س ۱۲ "حسن گوئی ... " مصرع وزن سے خارج ۔ ص ۵۱ س ۲ (شعر) ہر کر ہو ... صحیح ہر کر اُو ۔ ۶۵ / ۳ ، ۴ "مولانا شبلی ... سے کون پڑھا لکھا ناواقف نہیں" یہاں "اُن کون" کی جگہ کوئی ہے یا پھر "تا" زائد چھپ گیا ہے ۔ ص ۶۹ س ، فلق صحیح فلق ، ۱۷ / ۴ (شعر) سالِ رحلت ... یہاں سال بغیر اضافت کے ہوگا ۔ ۱۱۴ / ۱۷ ، " اس عیسائی نما مسلمان" الٹی ترکیب ہے "مسلمان نما عیسائی" صحیح ہے ۔ ص ۱۲۷ / ۵ پُر دل (؟) ص ۱۵۰ / ۱۰ شعر دھواں صحیح دھُواں ، ۱۵۸ / آخر میں رزم گاہ (زکے ساتھ) صحیح رزم گاہ (ر کے ساتھ) ، ۱۶۱ / ۷ جوازِ رحمت صحیح جوارِ رحمت ، یہی صفحہ سطر ۱۳ ، "گیا ۔ آخر ما ... " اسی طرح ہے ؟ ۱۹۶ / ۳ ولادت ۱۹۷۰ء غلط ہے (طباعت کی غلطی)

بہر حال ، کتاب "حیاتِ جاوداں" ایک نہایت دلچسپ ، افادیت و اہمیت کی حامل اور عشاق و طلبۂ اقبال کے لیے عمدہ تحفہ ہے ۔

All rights reserved. ©2002-2006

بنگلور (۱۹۲۹ء) میں اے ایچ عبدالرحیم اور عبدالجمیل کے ساتھ علامہ اقبال کی ایک تصویر

اقبال اور جدید دُنیائے اسلام

تبصرہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

مصنف — ڈاکٹر معین الدین عقیل

ناشر — مکتبہ تعمیر انسانیت۔ اردو بازار، لاہور

قیمت — ۷۵/ روپے

ضخامت — ۳۹۰ صفحات

شخصیات کے ضمن میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ کوئی شخصیت عظیم کیسے بنتی ہے اور داخلی اور خارجی عوامل کا کون سا تناسب کسی شخصیت کو عظمت کی بلندیوں تک پہنچاتا ہے۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ عظمت کے تعین میں معاصرت کا کیا رول ہے۔ معاصرت (زمانہ، ماحول اور احوال و ظروف) کبھی تو شخصیت کو عروج و کمال کی طرف لے جانے میں سہارا بنتی ہے اور کبھی رکاوٹ بھی بن جاتی ہے۔ بہرحال یہ مسلّم ہے کہ وقت بہت بڑا محاسب و منصف ہے۔ عظمت کے تعین میں اس کا رول بنیادی اور کلیدی ہے۔

جہاں تک علامہ اقبال کا تعلق ہے، اس بارے میں دو آرا نہیں ہو سکتیں کہ وہ بہرحال اور بہر اعتبار ایک عظیم شخصیت تھے۔ ایک ایسی شخصیت جو اپنے ماحول اور عصر سے پوری طرح باخبر اور آگاہ تھی اور حیات و کائنات میں رونما ہونے والی نت نئی تبدیلیوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے، اپنی حکمت و بصیرت سے اس کی تہہ تک پہنچنے اور ردِ ل ہینا کے ذریعے ان تبدیلیوں کی اصلیت و معنویت سے آگاہ ہونے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

علامہ اقبال نے مشرق و مغرب کے علوم و افکار کا باضابطہ مطالعہ کیا تھا۔ مشرق میں تو خیر

وہ پلے بڑھے تھے، انہیں مغرب کے ذاتی مشاہدے کا بھی موقع ملا۔ وہ مشرق و مغرب کی بہت سی پیش رو اور معاصر شخصیات، افکار و مذاہب اور تحریکات سے متاثر ہوئے اور انہیں متاثر بھی کیا۔ . . . . . یہ مطالعۂ اقبال کا ایک بڑا اہم، وسیع اور تحقیق طلب موضوع ہے۔ ڈاکٹر طمعین الدین عقیل نے، جو ایک باصلاحیت اسکالر اور متعدد علمی کتابوں کے مصنف ہیں، اس وسیع موضوع کے ایک جزو پر اپنی تازہ علمی کاوش پیش کی ہے۔

ڈاکٹر عقیل کی زیر تبصرہ کتاب کا مقصود یہ دیکھنا ہے کہ اقبال نے اپنی فکر کی تشکیل میں اپنے عہد تک کے کن مسلم مفکرین اور کن اسلامی تحریکات سے اثرات قبول کیے اور جدید دنیائے اسلام کے کن کن مسائل نے ان کی فکر اور شاعری کو متہیج کیا اور ان کے بارے میں اقبال کا نقطۂ نظر اور ردِ عمل کیا تھا۔

مقدمے میں مصنف نے جدید دنیائے اسلام کے تہذیبی اور سیاسی زوال اور فطری انحطاط اور اس کے نتیجے میں رونما ہوتے والی تبدیلیوں اور پیدا ہونے والے مسائل اور ان کے حل کے لیے ابھرنے والی تحریکوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کا یہ خیال درست ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں دنیائے اسلام کے ہر ملک کے مسائل مختلف تھے اور اس لحاظ سے ان کو مقامی حالات کی روشنی میں حل کیا جاسکتا تھا۔ بایں ہمہ مسائل کے حل کے لیے سرگرم عمل مصلحین اور راہنماؤں کے مقاصد میں ایک اشتراک نظر آتا ہے اور مختلف مفکرین کے افکار میں یکسانیت کا احساس ہوتا ہے۔

ان مفکرین میں علامہ اقبال کی حیثیت اس لیے اہم ہے کہ انہوں نے صرف برصغیر ہندوستان ہی کے نہیں، پوری دنیائے اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے تمام اہم مسائل پر سوچ بچار اور غور و تدبر کر کے ان کے حل کی تلاش کی مخلصانہ کاوش کی۔ وہ وہابی تحریک، شاہ ولی اللہ کی تحریک، سنوسی تحریک، علی گڑھ تحریک اور جمال الدین افغانی کی تحریک کے مقاصد و نظریات سے بڑی حد تک متفق تھے مگر ان کے بعض فکری پہلوؤں یا طریق کار کے ضمن میں ان کے مؤید نہ تھے بلکہ کئی پہلوؤں سے ان کے ناقد بھی تھے۔ البتہ ان سب شخصیات میں شاہ ولی اللہ، اقبال سے قریب تر نظر آتے ہیں، بلکہ ڈاکٹر عقیل تو یہ کہتے ہیں کہ

"اپنی فکر اور اپنے توسط سے اقبال نے فی الحقیقت شاہ ولی اللہ کی حکمت کا تکملہ پیش کیا ہے۔ ان کی فکر شاہ ولی اللہ کی تعلیمات سے کہیں انحراف نہیں کرتی؛ یہاں تک کہ

اقبالؔ نے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کی فکری آبیاری سے پیدا ہونے والی تحریکِ مجاہدین کو بھی استحسان کی نظر سے دیکھا ہے"۔

اتحادِ اسلامی کی تحریک کو فروغ دینے میں دوسرے اکابر کے ساتھ ساتھ اقبالؔ کا بھی بہت نمایاں حصّہ ہے۔ علامہ اقبالؔ کا تصوّرِ پاکستان بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ وطنی قومیت، خلافت، ترکی کی تحریکِ تجدّد، فلسطین اور مغربیت کے مسائل ان سب پر بحث کے لیے مصنّف نے ایک پورا باب وقف کیا ہے۔ اقبالؔ کی دلچسپی کا ایک بڑا محرک یہی اتحادِ اسلامی کا جذبہ تھا۔ مصنّف کے مطابق اقبالؔ کے اتحادِ اسلامی کے تصوّر میں مسلم ممالک کی جغرافیائی حدبندیوں کو ختم کر کے انہیں ایک وسیع ریاست میں ضم کرنا مقصود نہ تھا اور نہ ان کا منتہائے نظر کسی "پان اسلامی" ریاست کا قیام تھا۔ وہ تو بین الاقوامی بنیادوں پر ایک ایسے اسلامی اتحاد کے خواہش مند تھے جس میں اسلامی ممالک اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے ایک متحدہ قوّت کا روپ دھار سکیں جو مشرق و مغرب کی سامراجی اور استبدادی طاقتوں کے خلاف ایک سیاسی فصیل کا کام دے سکے۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت جیسے مسئلے پر بھی اقبالؔ جذباتیت سے الگ ہو کر سوچتے ہیں۔ وہ عالمِ اسلام کو کسی ایک خلیفہ کے تحت کرنے کے قائل نہ تھے اور ترکوں کی اجتہادی کاوشوں کو ایک حد تک تحسین کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

مغربیت کے خلاف اقبالؔ کی کاوشوں پر مصنّف نے بہت اچھی بحث کی ہے اور بجا طور پر اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقبالؔ نے جس شدّومد سے مغربیت کا رد کیا اور جس مستقل مزاجی اور تواتر سے اس کے خلاف اپنے جذبات و خیالات ظاہر کیے ہیں، اس لحاظ سے یہ موضوع ان کی فکر و شاعری کا ایک اہم اور بنیادی موضوع بن گیا۔

جہاں تک اشتراکیت کا تعلّق ہے، اقبال ابتدا میں مزدوروں کی بہبود کے نام پر برپا کیے جانے والے اس انقلاب سے خاصے متاثر تھے۔ ڈاکٹر عقیل نے بالکل درست لکھا ہے کہ اس احساس پر مشتمل ان کی متعدّد نظمیں ہیں جو "پیامِ مشرق"، اور "بانگِ درا" میں شامل ہیں۔ اصل میں علامہ اقبال بعض اعتبار سے خاصے خوش فہم واقع ہوئے تھے۔ اشتراکیت کے متعلّق ان کی ابتدائی خوش فہمیاں بھی بہت دلچسپ ہیں۔ مثلاً اسٹالن کے برسرِ اقتدار آنے پر انھوں نے اسے محمّد اسٹالن قرار دے کر اس سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ "لینن"، میں ڈاکٹر عقیل کو اس کی تعریف و تحسین نظر آتی ہے مگر ہمارے نزدیک یہ نظم اشتراکیت اور لینن کی کم عقلی پر ایک

زبردست چوٹ ہے کیونکہ اس نظم میں لینن اُس خدا جسے لینن نے اور نہ اشتراکیت نے کبھی مان کر دیا تھا، کے حضور پیش ہو کر اشتراکی فلسفے کا بطلان کرنے پر مجبور ہے۔

ضمیمے میں مصنف نے اقبال کی بعض پسندیدہ اور قابلِ توجہ شخصیات کا ذکر کیا ہے (ٹیپو سلطان، مہدی سوڈانی، سعید حلیم پاشا، مفتی عالم جان بارودی، مولوی ابو محمد مصلح اور سید ابو الاعلیٰ مودودی)۔

ڈاکٹر عقیل نے یہ کتاب بلاشبہ بڑی محنت سے لکھی ہے اور جملہ موضوعات کا پورا پورا احاطہ کرنے کی کاوش کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا وسیع مطالعہ، حوالوں کی تلاش و ترتیب اور اخذِ نتائج کا طریق کار عالمانہ ہے۔ تاہم یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بعض امور پر تحقیقِ مزید کی ضرورت ہے۔ یہ درست ہے کہ اقبال، سر سید احمد خان سے بہت متاثر تھے مگر یہ بات بہت اہم ہے کہ "جاوید نامہ" میں سر سید کا ذکر نہیں ہو سکا۔ (اس کا یہ جواب بالکل ناکافی ہے اور قطعاً اپیل نہیں کرتا کہ علامہ چاہتے تو تھے مگر انہیں خیال نہ رہا)۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اقبال، سر سید کے ایک شدید ناقد اکبر کے پُرجوش مدّاح ہیں۔ اسی طرح اقبال جدید نظامِ تعلیم (بحوالہ علی گڑھ) کے ناقد ہیں۔ جہاں تک سر سید کے مذہبی معتقدات کا تعلق ہے، مصنف لکھتے ہیں:

> "اپنے اعتقادات کے اعتبار سے سر سید احمد خان نے جہاں اختلاف کیا ہے، وہاں وہ تنہا نہیں بلکہ ہر مسئلے میں کم یا زیادہ، اکابر علمائے اسلام سر سید احمد خان کے ساتھ متفق الرائے ہیں جیسے امام غزالی، امام رازی، ابنِ رشد، شیخ اکبر، شاہ ولی اللہ وغیرہ (ص ۱۱۶)"

قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان اکابر نے تو جمہور علما سے محض ایک ایک مسئلے میں الگ راہ نکالی، مگر سر سید نے ان سب کو یکجا کر کے ان پر کاربند ہونا چاہا۔ اس اعتبار سے متذکرہ بزرگوں کے حوالے سے سر سید کے تجدّد کو کیونکر قبول کیا جا سکتا ہے۔ اصل میں سر سید کا المیہ یہ ہے کہ وہ اجتہادی ذہن رکھتے تھے اور انہوں نے تقلیدی ذہنیت کے خلاف جہاد بھی کیا ـــــــ مگر مغرب کے باب میں ان کا رویّہ سراسر مقلّدانہ بلکہ بسا اوقات غلامانہ نظر آتا ہے۔ وہ شدید ذہنی مرعوبیت کا شکار ہو گئے تھے۔ سر سید کی مغرب زدگی کے نتیجے میں وہ افسوس ناک صورتِ حال پیدا ہوئی (جس کا ڈاکٹر عقیل نے بھی اعتراف کیا ہے (ص ۱۱۳) اور جو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے صد درجہ نقصان دہ ثابت ہوئی۔

سنوسی تحریک کے ضمن میں بھی تحقیق مزید کی ضرورت ہے۔ علامہ اقبال جدید دنیائے اسلام میں وہابی تحریک کے بعد سنوسی تحریک کو کیوں دوسری اہم تحریک سمجھتے تھے یا

کیا خوب امیرِ فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا
تو نام و نسب کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا

اس شعر کا تاریخی پس منظر کیا ہے، وغیرہ۔

یہ بات افسوس ناک ہے کہ اس کتاب میں خصوصاً اس کے نصف آخری حصے میں کتابت کی خاصی اغلاط موجود ہیں۔ بعض جگہ لگتا ہے کہ کتابت میں کچھ سطریں چھوٹ گئی ہیں۔ ص ۲۹۲ پر حواشی درج نہیں ہو سکے۔ "تجدید و احیائے دین"، "الہدور البازغہ" کا نام بکثرت غلط لکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر عقیل کی یہ کتاب اقبالیات پر تحقیق کے لیے ایک نیا موضوع دیتی اور ایک نیا راستہ دکھاتی ہے۔ اس مطالعے میں محض ان مسائل، افکار اور تحریکات کو موضوع بنایا گیا ہے جن کا تعلق جدید دنیائے اسلام سے ہے اور جنھوں نے موجودہ اور آئندہ عہد کو متاثر کیا۔ تاہم یہ مطالعہ عہدِ اقبال تک محدود ہے۔ اقبال نے اپنے عہد پر جو فکری اثرات مرتب کیے اور عالمِ اسلام کو ذہنی اور سیاسی سطح پر جس طرح متاثر کیا، اس کے ہمہ گیر اثرات کا جائزہ لینا باقی ہے۔ یوں مصنف نے اس موضوع کا پس منظر تو فراہم کر دیا ہے مگر پیش منظر کیا ہے؟ اس سے بحث نہیں کی (چند سرسری اشارے کر دیے ہیں۔ یہ ان کا دائرۂ تحقیق بھی نہ تھا)۔ گویا انھوں نے ایک نئے راستے کی نشان دہی کر دی ہے، اب اس پر دادِ تحقیق دینا ماہرِ اقبالیات کے شناوروں کا کام ہے۔ تکمیل کا دعویٰ نہ ڈاکٹر عقیل نے کیا ہے اور نہ کسی عالم کو زیب دیتا ہے۔ کسی موضوع پر تعمیری بحث کا آغاز کرتے ہوئے ایک نیا در وا کر دینا ہی ایک بڑا کنٹری بیوشن ہے۔ اس کنٹری بیوشن پر ڈاکٹر عقیل یقیناً داد کے مستحق ہیں۔

سیالکوٹ کی معروف مسجد حسام الدین جہاں علامہ اقبال نے مولوی میر حسن سے ابتدائی تعلیم حاصل کی

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

اقبالِ ایران

تبصرہ : ڈاکٹر وحید عِشرت

مصنّف ——— ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی

ترتیب و تدوین ——— ضیاء محمد ضیاء

ناشر ——— بزمِ رُومی، سیالکوٹ

قیمت ——— ۵۰/- روپے (پیپر بیک) صفحات ۳۵۲

اس کتاب کی پیشانی پر صدرِ ایران علی خامنہ ای کا یہ جملہ کہ "ایران کا اسلامی انقلاب علامہ اقبالؒ کا مرہونِ منت ہے" اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ایران میں جدید فکریات اور انقلابی رجحانات کی تشکیل فکر و کلام اقبال کی رہینِ منت ہے۔ مطیع الدولہ حجازی نے یہ بڑا ہی درست تجزیہ کیا ہے کہ "اقبال نے ہماری ہزار سالہ ادبی میراث کو زندہ کر کے اس میں مشرق و مغرب کے جدید افکار و تعبیرات کا بھی اضافہ کیا ہے ——— وہ مجدّدِ ادبِ فارسی اور مجدّدِ فکرِ اسلامی ہے"۔ اقبال کے بارے میں ایران کے کم و بیش سبھی اہلِ فکر نے بڑی دانش مندانہ اور توصیفی باتیں کی ہیں مگر مطیع الدولہ حجازی نے فارسی ادب و شاعری کے لیے اقبال کو مجدّد قرار دیا تو یہ بڑی ہی معنی خیز بات ہے۔ اگر آپ فارسی شاعری اور ادبیات کا مطالعہ کریں تو آپ کو فارسی شاعری کی پوری روایت میں ملوکیت سرایت کیے ہوئے ملے گی۔ ملوکیت ایرانی مزاج میں اتنی رچی بسی ہوئی تھی کہ جاہ پرستی اور شاہ پرستی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ شیخ سعدی جیسا مصلح بھی قصّے کہانی ہی کے انداز میں بادشاہوں کو نصیحتیں کرتا ہے اور انہیں نیکی کی طرف رغبت دلاتا ہے۔ پوری ایرانی شاعری کسی تبدیلی، کسی انقلاب اور کسی جمہوری یا غیر ملوکانہ نظام کی بات تک کرنے سے قاصر ہے۔ فارسی شاعری نے حکمرانوں کے لیے عوام کو مسخر کرنے اور سلائے رکھنے کا وطیرہ اپنایا ہے۔

پوری فارسی شاعری میں اقبال اس لیے مجدّدِ ادبِ فارسی ہیں کہ انہوں نے اپنی فارسی شاعری میں "از خوابِ گراں خیز" کے نغمے کے ساتھ ساتھ انقلاب کے اسرار و رموز بھی سمجھائے ہیں۔ ملوکیت زدہ، مردہ اور بنجر ایرانی معاشرے کے لیے اقبال کی شاعری حیات و زندگی کا ایک تازہ

جھونکا تھی، اور یہی وجہ ہے کہ کروٹ لیتے ہوئے ایرانی معاشرے کو اقبال کی شاعری اور فکر میں زبردست اپیل نظر آئی۔ اس کتاب کے آخر میں ایران کے اہل علم و فکر کے اعترافات اقبال کی عظمت پر دال ہیں جن میں احمد سروش، ڈاکٹر رضا زادہ شفق، ڈاکٹر حسین خطیبی، علامہ دہخدا، ڈاکٹر علی شریعتی، پروفیسر سعید نفیسی، خطیبی اور پروفیسر کاظم رجوی کے نام شامل ہیں۔

اگر اقبال ایرانی انقلاب کے حدی خواں ہیں، اور بقول ڈاکٹر صدیق شبلی (بہ روایت پروفیسر مرزا محمد منور) ایک نازک موقع پر شاہ ایران چاہتے تھے کہ اقبال کے کلام پر پابندی لگا دیں، تو اس کا سبب ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی تھے جنھوں نے پاکستان کے پہلے کلچرل اتاشی کی حیثیت سے ایران میں فکر اقبال کی بڑی محنت اور لگن سے کاشت کی کہ ڈاکٹر حسین خطیبی، ڈاکٹر رضا زادہ شفق اور احمد سروش کو یہ اعتراف کرتے بنی کہ "عرفانی نے ہمیں اقبال سے متعارف کرا کے ہم پر جو احسان کیا ہے، اس کے لیے ہم تا ابد ممنون رہیں گے۔" اقبال اور عرفانی کے نام ایرانیوں کی زبان پر ایک ساتھ آتے ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی کے جذبۂ صادق نے علامہ اقبال کی شاعری اور فکر کو اہل ایران تک منتقل کرنے میں جو کام سرانجام دیا، اس کی ایرانیوں ہی نے نہیں، اہل پاکستان نے بھی ہمیشہ قدر کی ہے۔ آپ پاکستان اور ایران کے درمیان فکری کڑیاں ملانے والے ایک عظیم معمار ہیں۔

اس کتاب میں ایک تو ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی صاحب کی ایران میں اقبال شناسی کے ضمن میں کی جانے والی کوششوں کی تفصیل ہے کہ کس طرح انھوں نے بے سروسامانی کے عالم میں محض اپنی دلی لگن اور انفرادی کوشش سے اہل ایران کو اقبال تک پہنچانے کا ہفت خواں سر کیا، دوسرے ایران اور پاکستان کے علمی اور ثقافتی روابط پر سیر حاصل بحث ہے، پھر ملک الشعرا بہار کے ساتھ ڈاکٹر عرفانی کے روابط کی تفصیل ہے اور اسی طرح سید صادق سرمد، آیت اللہ کاشانی، ڈاکٹر محمد مصدق، احمد سروش اور ڈاکٹر علی شریعتی کے بارے میں بحث ہے۔ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے بھی رہنما ہے جو فکر اقبال کے فروغ اور پاکستان کے نظریے کے فروغ کی لگن دل میں رکھتے ہیں کہ جذبے اگر صادق ہوں تو وہ اپنی پرواز کے لیے بال و پر خود پیدا کر لیتے ہیں ـــــ یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان، ایران اور اقبال کے حوالے سے جب بھی کوئی بات ہوگی، ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی کا ذکر ضرور ہوگا۔ یہ کتاب اس قصۂ پارینہ کی بازخوانی ہی کا ایک دلکش اور دلچسپ باب ہے۔ خدا کرے پاکستان کو ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی جیسے کلچرل اتاشی اور سفارت کار نصیب ہوتے رہیں تاکہ وہ پیغام اور وہ نوائے انقلاب سب تک پہنچ سکے جو تہران کو عالم اسلام کا جنیوا بنا کر، اقبال لاہور سے تا خاک بخارا و سمرقند

ایک ولولۂ تازہ کی صورت پہنچانا چاہتے تھے کہ مسلمان نیل کے ساحل سے تابخاکِ کاشغر، حرم کی پاسبانی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں ـــــ اور شاید معرکۂ افغانستان نے اس انقلاب کے خواب کی تعبیر کی بنیاد رکھ دی ہے!

علامہ اقبال پنجاب یونیورسٹی سے (۱۹۳۳) ادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے
کے بعد گاؤن پہنے ہوئے ہیں

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

اقبال اور قومی یک جہتی

تبصرہ : ڈاکٹر وحید عشرت

مصنف ــــــــ سید مظفر حسین برنی

ناشر ــــــــ ہریانہ ساہتیہ اکادمی، چنڈی گڑھ بھارت

نہایت عمدہ نفیس کاغذ۔ صفحات ۶۲۔

بھارت میں اقبال کو شدھی کرنے کی جو مہم بھارتی حکومت کی سرپرستی میں، وہاں کے مراعات یافتہ مسلمانوں کے ہاتھوں ہو رہی ہے، "اقبال اور قومی یک جہتی" اس کی ایک افسوس ناک مثال ہے؛ تاہم یہ کتاب ایک المناک صورت حال کو بھی پیش کرتی ہے کہ کس طرح بھارت میں بعض مسلمان اقتدار میں رہنے، روزگار کے حصول اور اپنی بقا کے لیے بے کس و مجبور ہیں کہ انہیں کانگرس اور ہندوؤں کی خوشنودی کے لیے اپنی شناخت کے تمام نشانات خود اپنے ہاتھوں سے مٹانے میں بھی حجاب نہیں۔ اس کتاب میں اقبال ہی کے بارے میں انتہائی غلط بیانی سے کام نہیں لیا گیا بلکہ علم و تحقیق کے معروف اور مروّجہ اصولوں کی بھی نفی کی گئی ہے۔

اقبال کے پورے فکری تناظر کو ایک طرف رکھ کر چند جزوی باتوں، فقروں اور اقتباسات سے اپنی من مرضی کے مضمون کا استخراج کیا گیا ہے۔ ایک طویل عرصے سے بھارتی حکومت کی پروپیگنڈا مشینری یہ محسوس کرتی ہے کہ اقبال اور پاکستان لازم و ملزوم ہیں اور جب تک اقبال کی توانا فکر نظریۂ پاکستان کی پشت پر موجود ہے۔ پاکستان فکری اور نظری طور پر توانا ہے؛ چنانچہ بھارتی حکومت کی سربراہی میں یہ مہم چلائی جا رہی ہے کہ اقبال ایک عظیم شاعر ہیں اور برِصغیر بلکہ بھارت کے شاعر ہیں۔ اقبال کو ایک عظیم شاعر کہنے سے ان کی درپردہ کوشش یہ ہے کہ اقبال کے عظیم مفکر ہونے کے تصور کو دھندلا دیا جائے، اور اقبال کو پاکستان کے نظریہ ساز فلسفی ہونے کے بجائے اردو زبان کے دیگر شاعروں میں بریکٹ کر دیا جائے۔ اس سے ان کی مراد پاکستان اور اقبال کے درمیان بُعد کی ایک دیوار کھڑی کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے بھارت کی یونیورسٹیوں، علمی اداروں اور دیگر سربرآوردہ ادیبوں اور محققین سے کام لیا جا رہا ہے۔ بھارت میں اقبال

انسٹی ٹیوٹوں کا قیام اور اقبال مراکز کی سرپرستی کے پیچھے یہی منفی فکر کام کر رہی ہے۔

تحقیق کے نام پر اس طرح کی پروپیگنڈا کتب گزشتہ دس برسوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ آرہی ہیں اسی موضوع اور عنوان پر اس سے قبل پروفیسر حسن احمد کی کتاب علی گڑھ یونیورسٹی سے شائع ہوئی اور یہی من پسند موضوع سیّد مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ نے اپنی اردو اور انگریزی کتب میں اپنایا ہے۔ 'محبِ وطن اقبال'، اور 'اقبال اور قومی یک جہتی' پاکستان کے خلاف اقبال کے نظریات توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی ایک غیر دیانت دارانہ سعیِ نامبارک ہے۔

سیّد مظفر حسین برنی، علامہ اقبال کی وطن اور سرزمین ہند و پاک سے محبت ظاہر کرنے والی جن نظموں سے اپنے دلیل لاتے ہیں، وہ اس لیے غلط ہے کہ اقبال نے ہندوؤں کے بھارت سے کبھی یک جہتی ظاہر نہیں کی، وہ مسلم ہندوستان کی بات کرتے تھے جس میں مسلمان اقتدار میں تھے اور ہندو ان کی رعایا تھے۔ اسی لیے اقبال 'ترانۂ ہندی' میں کہتے ہیں:

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

اقبال کا اپنا تخصص مسلم ہندوستان سے ہے جس کے کنارے مسلمانوں نے اپنے اقتدار کے جہاز کو لنگر انداز کیا، ہندو نشاۃِ ثانیہ کے 'خواب' بھارت سے نہیں ہے۔ پھر سیّد صاحب خود کہتے ہیں کہ اقبال کی قومی اور وطن سے محبت والی نظمیں ان کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ اقبال اپنے فکری ارتقا کے بالکل ابتدائی دور ہی میں وطن پرستانہ تصورات رکھتے تھے۔ اپنے فکری ارتقا کے نصف النہار میں وہ خالصتاً اسلامی تصورات پر اصرار کرتے رہے۔ تاہم ہمارا کہنا یہ ہے کہ اقبال کی اپنی مٹی، اپنی سرزمین سے محبت والی نظمیں وطن سے جس محبت کا اظہار کرتی ہیں، وہ فطری محبت ہے۔ اقبال برصغیر میں پیدا ہوئے اور ان کی ذہنی وابستگی فطری طور پر اسی سرزمین سے تھی۔ اس لیے یہاں کے پہاڑ، دریا یا افراد سے ان کی محبت ان کی اپنے وطن سے فطری محبت کی شاہد ہے جو ایک مسلمان کی ایمانیات کے منافی نہیں۔ اقبال کی شاعری میں البتہ وطن کی محبت مسلم ہندوستان سے محبت ہے۔ دوسرے، اقبال کی وطن سے محبت سے بھارت یا کانگرس کے اکھنڈ بھارت کے تصور یا ایک قومی نظریے سے کوئی رابطہ استوار نہیں کیا جاسکتا۔ تیسرے، وطن سے اس شدید محبت کے باوصف جب وہ سارا ہندوستان چھوڑ کر مسلم اکثریت کے شمال مغربی علاقے میں مسلمانوں کو آزادانہ طور پر اپنی مرکزیت قائم کرنے پر آمادہ کرتے ہیں تو اس سے ان کے ذہنی سفر اور ارتقا کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی قومی یک جہتی

مسلمانوں کی یک جہتی تھی، ہندو ـــــ مسلم یک جہتی نہیں تھی کیونکہ ہندو ـــــ مسلم یک جہتی کے پردے میں ہندو اکثریت کو برِصغیر میں اقتدار پر براجمان کر کے مسلمانوں کو ان کی غلامی میں دینے کا خطرناک منصوبہ شامل تھا۔ یہی وہ نقطہ ہے جس کو برصغیر میں ہندو ـــــ مسلم اتحاد کے کانگرسی مسلمان سمجھ نہ سکے اور انہوں نے اپنے ہاتھوں سے مسلمانوں کے لیے بڑے ہی ارزاں داموں غلامی خریدی ورنہ اگر تمام برِصغیر کے مسلمان ایک ہوتے اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جمع ہوتے تو شاید پاکستان کا نقشہ بہت مختلف ہوتا اور موجودہ بھارت کے مسلمانوں کو بھی آزادی کا سانس نصیب ہوتا۔

اس کتاب کا سب سے افسوس ناک پہلو ایک مسلّم حقیقت کا انکار ہے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو، تھامپسن اور مولانا راغب احسن کے حوالے سے پروفیسر حسن احمد نے اپنی کتاب "اقبال آن دی کراس روڈ" میں بھی یہ ثابت کرنے کی سعی کی تھی کہ اقبال پاکستان کی موجودہ اسکیم کے حامی اور مؤید نہیں تھے اور ۱۹۳۰ء میں اپنے خطبۂ الہ آباد میں انہوں نے محض مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے ایک الگ مسلم ریاست کا تصور پیش کیا تھا اور بعد میں وہ ہندوستان کے اندر ایک مسلم اکثریتی صوبے کے حامی بن گئے تھے۔ اس سفید جھوٹ کی جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال، پروفیسر محمد منوّر اور متعدد دوسرے زعماء نے وضاحت کی مگر یہ جھوٹ سر بھارتی ایک پورے تواتر کے ساتھ بول رہا ہے۔ خود سیّد مظفّر حسین برنی نے پروفیسر آل احمد سرور کا بھی حوالہ دیا ہے کہ انہوں نے تھامپسن کی روایت کو غیر معتبر قرار دیا ہے۔ جہاں تک پنڈت نہرو کا تعلق ہے تو ان کی بات ہی اور ہے۔ وہ جھوٹ بولنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ جب پنڈت نہرو نے علامہ اقبال سے ملاقات کی تھی تو انہوں نے علامہ اقبال سے کہا تھا کہ مسلم قوم جناح کے بجائے آپ کی بات زیادہ مانتی ہے اور آپ سے زیادہ بہتر طور پر مفاہمت ہو سکتی ہے تو اس وقت علامہ اقبال نے کہا تھا کہ میرا اور مسلمانوں کا قائد تو محمد علی جناح (قائداعظمؒ) ہے یعنی علامہ اقبال نے قائداعظمؒ پر اعتماد کیا اور ان کی تائید کی جس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال کی ذہنی اور فکری اپروچ اور تائید قائداعظمؒ کے ساتھ تھی۔ پھر قائداعظمؒ نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قراردادِ پاکستان کی منظوری پر فرمایا کہ آج اقبال ہوتے تو کتنے خوش ہوتے کہ مسلم لیگ نے بالآخر انہی کی راہ اپنائی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اقبال اور قائداعظمؒ کی فکری ہم آہنگی زیادہ معتبر ہے۔ پھر تھامپسن اور راغب احسن کا جو حوالہ سیّد برنی نے دیا ہے، وہ ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء کا زمانہ ہے؛ جبکہ قائداعظم کو علامہ نے جو خطوط لکھے اور جن میں آزاد مسلم ریاست کی بات کی، وہ جون ۱۹۳۷ء کے زمانے کے خطوط ہیں جس سے تھامپسن اور راغب احسن، دونوں کے مواقف کی تردید ہوتی ہے۔

اس سارے قصے میں اصل بات یہ ہے کہ علامہ اقبال نے تھامپسن اور راغب احسن سے

شمال مغربی ہند کے مسلم اکثریتی علاقے میں مسلمانوں کی ایک آزاد ریاست کے قیام کی اپنی تجویز کو غلط نہیں کہا تھا اور نہ اس سے دست برداری کا اعلان کیا، بلکہ ہر موقع پر ایک تواتر اور تسلسل کے ساتھ وہ اس پر زور دیتے رہے اور اس کو مسلمانوں کے ثقافتی، مذہبی اور معاشی مسئلے کا حل قرار دیتے رہے اور علامہ اقبال نے پاکستان کی اس تجویز سے اپنی برأت کا اعلان کیا تھا جو چودھری رحمت علی نے پاکستان کے نام سے پیش کی تھی۔ اقبال کی مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ریاست کا اس وقت تک کوئی نام نہ تھا جبکہ چودھری رحمت علی نے اپنی تجویز جس میں انھوں نے پاکستان کے نام سے ایک ناقابلِ عمل تصوّر دیا تھا جس میں پاکستان، بنگستان، عثمانستان، صدیقستان، فاروقستان، حیدرستان، بلوچستان، صفستان اور نصیرستان کے نام سے مختلف آزاد مسلمان ریاستوں کا وفاق تجویز کیا گیا تھا حتیٰ کہ چودھری صاحب نے بعض سمندروں اور جزیروں کے نام بھی نئے تجویز کیے تھے۔ یہ پاکستان کی اسکیم علامہ اقبال کی نہ تھی۔ بلکہ چودھری رحمت علی کی تھی مگر اس زمانے میں تاثر یہ دیا گیا کہ یہ تجویز بھی اقبال کی ہے۔ اقبال نے اس تجویز پر جو پاکستان کے نام سے پیش کی گئی تھی، کہا کہ یہ میری تجویز نہیں ہے۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں نکالا جا سکتا کہ وہ مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ریاست کی تجویز سے دستبردار ہو گئے تھے۔ علامہ اقبال نے پاکستان کا لفظ اپنی ریاست کے لیے استعمال نہیں کیا تھا، یہ تو ہندوؤں کا مسلسل پروپیگنڈا تھا کہ مسلمان پاکستان بنانا چاہتے ہیں جس سے مسلم لیگ نے یہ نتیجہ کر لیا کہ وہ مسلم اکثریتی علاقوں میں قائم ہونے والی ریاست کو پاکستان ہی کہیں گے۔ علامہ اقبال نے چودھری رحمت علی کی پاکستان اسکیم کے بارے میں کہا تھا کہ یہ میری تجویز نہیں، یہ ایک حقیقت کا اظہار تھا مگر جب اقبال ۱۹۳۷ء میں موجودہ پاکستان پر مشتمل ایک آزاد ریاست کے قیام کے لیے قائداعظم کو خط لکھتے ہیں تو انہیں اس آزاد مسلم اکثریتی ریاست کا بانی اور مفکر کہا جائے گا جسے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو پاکستان کا نام دیا گیا۔ چودھری رحمت علی کی پاکستان اسکیم سے علامہ اقبال کے اظہارِ عدم تعلق سے اسی اسکیم سے اظہارِ عدم تعلق مراد لیا جائے گا، قائداعظم کے پاکستان سے اظہارِ عدم تعلق مراد نہیں لیا جا سکتا کیونکہ قائداعظم کے نام علامہ کے خطوط اس بات کی شہادت فراہم کرتے ہیں کہ علامہ موجودہ پاکستان کے لیے اپنی صحت کی کمزوری کے باوجود، ایک تسلسل سے قائداعظم کو ترغیب و تائید فراہم کرتے رہے۔ لہٰذا موجودہ پاکستان سے اقبال کا تعلق ان بودی دلیلوں اور لفظوں کی چالاکیوں سے کمزور نہیں کیا جا سکتا۔

علمی سطح پر غیر محققانہ استدلال اور سیاسی مقاصد کے تحت پروپیگنڈا مزاج رکھنے کی وجہ سے کتاب مایوس کن ہے اور مسلّمہ حقائق کو نظر انداز کر کے غیر مصدّقہ روایات پر استوار ہونے

کی وجہ سے خاص کمزور ہے، اور سوائے اپنے قارئین کو جو یک طرفہ طور پر محض ایسی ہی کتب پڑھتے ہیں، حقائق سے ناواقف رکھنے کی کوشش کے سوا کچھ اور نہیں۔

کتاب عمدہ کاغذ پر بڑے اہتمام سے شائع کی گئی ہے، شاید اس لیے کہ کتاب ایک گروہ کی ہے اور تجارت کے شاطرانہ مقاصد کی تکمیل کرتی ہے۔

---

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006
اقبال سائبر لائبریری

CyberLibrary.Net
All rights reserved.

علامہ اقبال آل انڈیا مسلم لیگ الہ آباد کے اجلاس منعقدہ ۱۹۳۰ء میں تاریخی صدارتی
خطبہ پڑھ رہے ہیں۔ یہی خطبہ بعد میں تحریک پاکستان کی اساس ثابت ہوا

اقبال کا آخری معرکہ

تبصرہ : ڈاکٹر وحید عشرت

مصنف ــــــــ سید نور محمد قادری

ناشر ــــــــ ضیاء القرآن پبلی کیشنز گنج بخش روڈ لاہور

قیمت ــــــــ ۳۰ روپے

کاغذ سفید، مجلد صفحات ۱۷۵

سید نور محمد قادری کے نزدیک اقبال کا آخری معرکہ وہ ہے جو متحدہ وطنیت اور مسلم قومیت کے درمیان ہوا جس کے ایک پلڑے میں کانگرس، مسلمان نیشنلسٹ، مولانا ابوالکلام آزاد، جمعیت العلمائے ہند کا مدنی گروپ تھا تو دوسری طرف مسلم لیگ، حضرت علامہ اقبال، حضرت قائدِ اعظم اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ تھے۔ مؤخر الذکر نکری طور پر تو مسلم لیگ کے مسلم قومیت کے تصور کے ساتھ تھے، تاہم عملی طور پر انہوں نے مسلم لیگ سے تعاون نہ کیا۔ مسلمان علما میں سے مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا جمال میاں فرنگی محلی، مولانا سید سلیمان ندوی، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالحامد بدایونی اور متعدد مشائخ عظام تھے جنہوں نے اس تاریخ ساز اور نازک موقع پر اپنا وزن مسلم قومیت کے تصور کی حمایت کے پلڑے میں ڈالا۔ کتاب کے مصنف نے بڑی عمدگی اور دیانت داری کے ساتھ تاریخ کے اس اہم ورق کا مطالعہ پیش کیا ہے اور اس دکھ اور کرب کا اظہار کیا ہے کہ تاریخ کے اس اہم موڑ پر پاکستان مخالف علماء نے مسلمانوں کی بقا کی جنگ میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کی بجائے برِ صغیر کے مسلمانوں کا وجود مٹانے کی خواہش مند جماعت، کانگرس کا ساتھ دیا۔ چند نجی اور ذاتی مفادات، اپنی اناؤں اور مالی فوائد کے لیے وہ مسلمانوں کے ملی وجود سے کٹ کر رہ گئے۔ دیوبند کے مطبخ کے اخراجات جیسی حقیر چیز کے لیے انہوں نے برِ صغیر کے مسلمانوں کی آزادی کو داؤ پر لگا دیا۔ وہ کانگرس کی اندھی عقیدت اور حمایت میں گاندھی اور جناح میں فرق نہ کر سکے۔ سید نور محمد کی کتاب کی سب سے تلخ بات یہ بھی ہے کہ مولانا سید حسین احمد مدنی کی کانگرس پرست

ایک قومی نظریے کی حمایت کی پالیسی پر جب علامہ اقبال نے انہیں اپنی ایک مختصر سی نظم میں ٹوکا تو انہوں نے اپنے نظریے سے رجوع کر لینے کے جرأت مندانہ رویے کے بجائے لاطائل مباحث سے کج بحثی شروع کر دی اور کہا کہ میرا مفہوم یہ نہیں تھا، جس پر علامہ نے ایک فراخ دل اور وسیع الذہن انسان کی طرح زیادہ زور نہ دیا اور ایک عالم کے احترام میں درگذر کا رویہ اختیار کیا، مگر افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ علامہ کے انتقال کرتے ہی مولانا حسین احمد مدنی نے اپنا پینترا بدلا اور پھر اپنے اصل موقف کو دہرانا شروع کر دیا۔ اس دو رُخی کو جو بھی نام دیا جائے، یہ بات ایک متشرع عالم دین کے شایاں نہ تھی مگر قائداعظم اور مسلم لیگ کی مخالفت اور گاندھی اور کانگرس سے اظہار عقیدت کی جو پٹی ان کی آنکھوں پر بندھ چکی تھی، یہ اسی کا ایک رُخ تھا۔ اس کتاب میں اس اجمال کی تفصیل دی گئی ہے اور مولانا مدنی کے اپنے رویے پر، بعد از وفات اقبال، دوبارہ لوٹ آنا ہے اور فدائینِ اقبال کی طرف سے جوابات بھی جمع کر دیے گئے ہیں۔

اس کتاب میں اس مسئلے پر دونوں نقطہ ہائے نظر کا تجزیہ ہے اور یہ کتاب اس دعوے کی بھی قلعی کھولتی ہے کہ کانگرس کے حامی علماء کا مسلم لیگ سے اختلاف مبنی بر اخلاص تھا اور وہ متحدہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کے ہیرو تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد مولانا مدنی گروپ کی طرف سے یہ پروپیگنڈا اب عام طور پر کیا جا رہا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ کانگرس پرست علماء مسلم لیگ سے مالی اور دیگر فوائد کے حصول میں ناکامی کے بعد کانگرس سے مالی فوائد حاصل کرتے رہے اور مسلم لیگ میں شامل ہو کر در پردہ کانگرس کے مقاصد کے لیے کام کرتے اور مسلم لیگ کے اندر کانگرس کی لابی تیار کرتے رہے جس پر جب گرفت کی گئی تو انہیں مسلم لیگ سے نکلتے ہی بنی۔ یہ کتاب ماہنامہ "الرشید" ساہیوال کے مدنی نمبر کا جواب ہے جس میں علامہ اقبال اور حسین احمد مدنی کے حوالے سے مباحث میں مولانا مدنی کی معصومیت کو ثابت کیا گیا ہے۔ ایسا ہی رویہ مولانا یوسف سلیم چشتی مرحوم اور ڈاکٹر اسرار احمد نے بھی کیا اور یک طرفہ طور پر مولانا مدنی کی حمایت کرتے ہوئے علامہ مرحوم پر نکتہ چینی کی۔ معرکۂ وطن و دین کی تفہیم میں ان بزرگوں نے جو ٹھوکریں کھائی ہیں اور عصرِ حاضر کے تصورات کی عدم تفہیم میں ان کا جو رویہ سامنے آیا ہے، وہ جدید مسلم تاریخ کا افسوسناک باب ہے، اور سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ ان دینی تصورات کی نفی ایسے لوگوں کی طرف سے ہو رہی ہے جو متشرع اور دین کے علم بردار ہیں اور جس کے نتیجے میں جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اور ان علماء کے درمیان مغائرت کی دیوار روز بروز اونچی ہو رہی ہے۔

یہ کتاب ایک دینی حلقے ہی کی طرف سے پیش کی گئی ہے۔ سید نور محمد قادری نے یہ ایک اہم خدمت سرانجام دی ہے، تاہم اس کتاب میں دو باتیں درست نہیں۔ علامہ اقبال کی وطن سے محبت کو

ظاہر کرنے والی نظموں سے یہ استخراج کسی طرح درست نہیں کہ وہ شروع میں کانگرس کے حامی تھے۔ حضرت قائدِ اعظم یقیناً کانگرس میں ابتداً شامل رہے مگر علامہ اقبال کی کوئی تحریر یا بیان یا رویّہ اس کی تائید نہیں کرتا۔ وطن سے محبت الگ چیز ہے اور کانگرس کا ایک قومی نظریہ الگ۔ دونوں کو ملانا اور یہ کہنا کہ علامہ شروع میں کانگرس کے حامی تھے، تاریخی طور پر غلط بات ہے۔ علامہ، سیّد میر حسن کے توسط سے سرسیّد تحریک سے وابستہ تھے اور شروع ہی سے سرسیّد کے دوقومی نظریے سے متعلق تھے۔ وطن سے محبت پر مبنی نظمیں کانگرس کی نہیں، مسلم ہندوستان سے علامہ کی وابستگی اور محبت پر دال ہیں۔ ترانۂ ہندی میں بھی جب اقبال کہتے ہیں۔

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو ؟
اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

تو اقبال، ہندوستان میں مسلمانوں کی وردد اور اس پر اُن کے اقتدار کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی، اور اب بھارت کے ہندو یہ ترانے گاتے ہوئے ایسے اشعار کو حذف کر دیتے ہیں۔ لہٰذا کتاب کے صفحہ ۲ پر قادری صاحب کا یہ کہنا کہ علامہ شروع شروع میں کانگرس سے متاثر تھے، متحدہ قومیّت یعنی نسلی بنیادوں پر ایک قوم ہونے کے حامی تھے، ایک غلط فہمی پر مبنی دعویٰ ہے۔ انھوں نے جن نظموں کو اپنے دعوے میں پیش کیا ہے، وہ مسلم ہندوستان کی تصویر کشی کرتی ہیں، اقبال کو گاندھی اور نہرو کے متحدہ بھارت کا حامی کسی طور پر ثابت نہیں کرتیں۔ اس سلسلے میں محمد احمد خان کی رائے بھی غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں کیونکہ یہ الزام اس سے قبل علامہ پر کسی اور نے نہ ان کی زندگی میں اور نہ بعد میں لگایا۔ دراصل علامہ کے سیاسی نظریات کی تشکیل ہی قیامِ یورپ کے زمانے میں ہوئی، اس سے پہلے ان کا سیاسی نظریہ مترشح کرنا ایک ناروا بات ہے۔

بہرحال، یہ کتاب ہماری ملّی تاریخ کے ایک اہم ورق کی نقاب کشائی کرتی ہے اور پاکستان دشمن علماء کے جذبات، اُن کی ہندو پروری اور کانگرس سے وابستہ مفادات کی حقیقت کو عیاں کرتی ہے۔ آخر میں مسلم لیگ دشمن علماء کے سرخیل سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کا ایک واقعہ درج کیا گیا ہے جو اسی کے ایک معتمد ساتھی شورش کاشمیری نے لکھا ہے۔ اس سارے تناظر کی تفہیم کے لیے ہم اسے ذیل میں درج کرتے ہیں:

"ایک دفعہ دورانِ تقریر شاہ صاحب سے کسی نے سوال کیا شاہ جی! جناح سے آپ کا کیا اختلاف ہے؟

فرمایا، کوئی نہیں۔

وہ۔ ایک کیوں نہیں ہو جاتے؟

شاہ جی۔ بھئی میں تو ان کی کفش برداری کرنے کو تیار ہوں لیکن میرے ذہن میں بعض کانٹے ہیں۔ وہ (قائد اعظم) یاد فرمائیں، میں سر کے بل جاؤں گا۔ سمجھا دیا تو آرام سے بیٹھیں، اُن کی لڑائی خود لڑوں گا۔ لیکن وہ ہم سے بات نہیں کرتے، صرف بیعت چاہتے ہیں۔

مجمع دیہاتی تھا۔ قائد اعظم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

میری گھگری نوں گھنگھرو لوا دے، جے توں میری ٹور ویکھنی!

(شورش کاشمیری "عطاء اللہ شاہ بخاری" مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء، ص ۲۸۹)

افسوس تو اس بات کا ہے کہ قائد اعظم اور مسلم لیگ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی کی "گھگریوں" کو گھنگھرو نہ لگوا سکی جس کی خاطر انہیں گاندھی، نہرو اور کانگرس کے پاس جانا پڑا اس سارے ڈرامے کا یہی المیہ تھا۔

Iqbal Cyber Library.net W.W.W All rights reserved. ©2002-2006 اقبال سائبر لائبریری

اقبال اور بلوچستان

تبصرہ : ڈاکٹر وحید عشرت

مصنّف ______ ڈاکٹر انعام الحق کوثر

ناشر ______ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

قیمت ______ -/۶۵ روپے (پیپر بیک) صفحات ۲۱۶، کتابت و طباعت عمدہ

ممتاز محقق اور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی کتاب "علامہ اقبال اور بلوچستان" حکیم الامت علامہ محمد اقبال سے اہلِ بلوچستان کی عقیدت و محبت کی کہانی ہے۔ بلوچستان کی سرزمین کو بھی یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے اپنے نظریہ ساز فلسفی شاعر کے قدم چومے اور ان سے بھرپور اظہارِ محبت کیا۔ بلوچستان کے لوگ قبائلی روایات کی محبت سے سرشار ہیں۔ اسلام اور پاکستان سے ان کی محبت لازوال ہے۔ اقبال شناسی بھی اسی عقیدت کا مظہر ہے۔

ڈاکٹر انعام الحق کوثر سے کوئٹہ میں پاکستان فلسفہ کانگریس کی سالانہ کانفرنس کے سلسلے میں جون ۸۶ء میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے اپنی یہ کتاب عنایت فرمائی۔ اقبالیات ان کی تحقیق اور مطالعے کا ایک بنیادی موضوع رہا ہے۔ چنانچہ ۵۴-۱۹۵۳ء میں انہوں نے اقبال اکادمی کے کل پاکستان مقابلۂ مضامین میں پہلا انعام بھی حاصل کیا۔ میرے لیے یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ اس موضوع پر لکھنے کے لیے تحریک دینے والوں میں میرے استاد پروفیسر خواجہ غلام صادق مرحوم بھی تھے جن کا ذکر ڈاکٹر کوثر نے اپنے دیباچے میں کیا ہے۔

کتاب بنیادی طور پر تین حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ علامہ اقبال کی بلوچستان میں آمد اور وہاں کے بعض اہم حضرات کے علامہ سے تعلقِ خاطر پر مبنی ہے۔ دوسرے حصے میں ان اداروں کا ذکر ہے جو علامہ کے فکر و فن کے تعارف اور احیاء کے لیے وجود میں آئے اور تیسرا حصہ ان لوگوں کے تذکرے سے عبارت ہے جنہوں نے فکر و فنِ اقبال کے فروغ میں حصہ لیا۔ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں بلوچستان کا جغرافیائی تعارف، دوسرے میں علامہ اقبال کی بلوچستان میں آمد،

تیسرے میں بلوچستان کے بعض اکابر کی علامہ اقبال سے ملاقات، چوتھے میں اقبال کے یادگاری ادارے، پانچویں میں بلوچستان کی ادبی شخصیات اور علامہ اقبال، چھٹے میں بلوچستان کی درس گاہوں میں مطالعۂ اقبال ــــــ ان کے میگزین کے حوالے سے اور ساتویں باب میں پشتو، بلوچی اور براہوی زبان میں علامہ پر کام کی تفصیل درج ہے۔

ڈاکٹر کوثر کا یہ کام ہر لحاظ سے خوب اور قابلِ قدر ہے۔ یہ کتاب بلوچستان کے بارے میں وہاں کے ادیبوں، انجمنوں اور سکول اور کالج میگزینوں کے بارے میں بھی بڑی مفصل معلومات فراہم کرتی ہے؛ تاہم اقبالیات کا ڈاکٹر انعام الحق کوثر پر ایک قرض بھی ہے، اور وہ یہ کہ علامہ اقبال پر بلوچستان میں ہونے والے تمام کام کو جمع کر کے، تدوین کرنے کے بعد مرتب کیا جائے اور ایک عمدہ مجموعۂ مقالات تیار کیا جائے اور وہ مقالات جو اس انتخاب مجموعۂ مقالات میں نہ آسکیں، ان کی تلخیص کر دی جائے۔ اس سے دو فائدے حاصل ہوں گے ایک تو بلوچستان کا تمام ذخیرۂ اقبالیات یکجا ہو جائے گا، دوسرے اس سے دیگر اہلِ علم میں بھی فکرِ اقبال پر کام کرنے کی تحریک پیدا ہو گی۔ اس کام کی تفصیل ان کی کتاب میں موجود ہے، لہٰذا اس کام کے لیے ان سے بہتر شاید ہی کوئی شخصیت ہو۔

اس کتاب کی اشاعت کی خواہش اقبال اکادمی نے بھی کی تھی، تاہم یہ سعادت علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے حصے میں آئی۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبۂ اقبالیات اور مطبوعات کمیٹی نے فکرِ اقبال کے حوالے سے کئی اہم کتب شائع کی ہیں جن میں سب سے اہم تسہیل خطباتِ اقبال بھی ہے جس میں علامہ اقبال کے ہر خطبے کے مندرجات اور موضوعات پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ تفہیمِ اقبال کے ضمن میں اقبالیات کے فروغ کے اس ادارے کی مدتِ قیام مختصر سہی؛ تاہم اس کی سرگرمیاں بڑی ہی وقیع ہیں۔ اقبال اور بلوچستان، تسہیل خطباتِ اقبال، تقاریر ــــ بیادِ اقبال، اقبال ــــ بچوں اور نوجوانوں کے لیے اور اقبال کا تجزیاتی اشاریہ اس کی شناخت ہیں۔

بیا بہ مجلسِ اقبالؔ

تبصرہ : ڈاکٹر وحید عشرت

(علامہ اقبال کے افکار اور محبوب شخصیات کا مطالعہ)

مصنّف ــــــ ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

ناشر ــــــ بزمِ اقبال کلب روڈ لاہور

قیمت ــــــ ۵۰/- روپے، کاغذ سفید، مجلّد گرد پوش کے ساتھ ٹائپ میں

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی سابق استاد زبان و ادب فارسی گورنمنٹ کالج لاہور ایک خاموش محقق اور اقبالیات کے ایک سچے طالب علم ہیں۔ ان کے متعدد وقیع مقالات اور کتب شائع ہو چکی ہیں۔ "ذکرِ رسولؐ، مثنوی مولانا روم میں" پر آپ کو سیرت ایوارڈ بھی ملا ہے۔ ڈاکٹر یزدانی کی زیرِ تبصرہ کتاب میں تین ایسے حضرات کا ذکر ہے جو علامہ اقبال کے ممدوح رہے ہیں۔ ان میں ناصر خسرو، مسعود سعد سلمان اور سلطان مظفر گجراتی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ناصر خسرو کا ذکر اقبال نے "جاوید نامہ" میں کیا ہے۔ علامہ نے اس شاعر کے ایک قصیدے کے پانچ شعر درج کیے ہیں جن میں ناصر خسرو کے اس نظریے کی بازگشت سنائی دیتی ہے کہ اسلام کی اصل دو چیزیں ہیں: ایک کتاب اللہ (قرآن) اور دوسرے ذوالفقار۔ ناصر خسرو اسمٰعیلی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ ۳۹۴ھ میں قبادیان، بلخ میں پیدا ہوا۔ وہ نہ صرف حافظِ قرآن تھا بلکہ منطق، علومِ متداولہ اور فلسفے پر بھی گہری نگاہ رکھتا تھا۔ ناصر خسرو کے بارے میں ڈاکٹر یزدانی نے ایک سیر حاصل مقالہ تو لکھا ہے جس سے اس کی شخصیت کے بارے میں بڑی آگاہی ہوتی ہے؛ تاہم ناصر خسرو اور اقبال کے درمیان فکری اور عملی سطح پر کیا مشترکات تھے اور علامہ اقبال اور ناصر خسرو میں کیا ذہنی قربتیں تھیں، اس مضمون میں ظاہر نہیں ہو سکا۔ دونوں کا تقابلی اور فکری مطالعہ اس مقالے کی ایک ناگزیر ضرورت تھی جو نظر انداز ہو گئی ہے۔ اور جو اس مقالے کو زیادہ وقیع بنا سکتی تھی؛ تاہم میرا احساس یہ ہے کہ یہ ڈاکٹر صاحب کے اوّلین مقالات میں سے ہے اور شاید اسی باعث یہ پہلو تشنہ رہ گیا ہے۔

دوسری شخصیت مسعود سعد سلمان کی ہے۔ یہ مقالہ 'اقبالیات' میں شائع ہو کر داد پا چکا ہے۔ عقاب یا شاہین کا تصوّر، مومنانہ صفات کے حوالے سے، شاید اقبال نے مسعود سعد سلمان سے متاثر ہو کر ہی لیا ہوگا جس کی طرف فاضل مصنّف اشارہ کرتے ہیں، مگر اقبال کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے عقاب کو اپنی شاعری میں مردِ مومن کا حوالہ بنایا جبکہ مسعود سعد سلمان نے محض ایک بادشاہ کے عقاب کی تعریف میں اس کی مومنانہ صفات کا تذکرہ کیا۔ اقبال کے ہاں شاہین ایک علامت ہے جبکہ مسعود سعد سلمان کے ہاں شاہین کا ذکر عمومی طور پر کیا ہے۔ ڈاکٹر یزدانی نے مسعود سعد سلمان کا سوانحی اور ادبی مقام بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ مگر شاید یہاں بھی اقبال اور مسعود سعد سلمان کا ذہنی اور فکری توافق کچھ زیادہ عیاں کرنا ضروری تھا۔

سلطان مظفر گجراتی بھی علامہ اقبال کے ایک ممدوح تھے۔ اصلی نام خلیل خان تھا اور سلطان محمود بیگڑہ والیِ گجرات کے چوتھے لڑکے تھے۔ ۸۷۵ھ میں پیدا ہوئے۔ تلاوتِ قرآنِ حکیم اور شب بیداری میں شہرت تھی اور حافظِ قرآن اور علومِ ظاہری و باطنی سے مرصّع نہایت شجاع تھے۔ اقبال نے ایک نظم میں ان کے زہد و تقویٰ کو اُجاگر کیا ہے کہ سلطان کے پاس ایک گھوڑا تھا، جب وہ بیمار ہوا تو حکیموں نے اس کے علاج کے لیے اسے شراب پلائی جس پر سلطان نے اس پر سواری ترک کر دی۔ اسی طرح بچپن میں جب وہ بیمار ہوئے تو ان کی دادی نے انہیں شراب پلائی جس پر انہوں نے قے کر دی۔ ان کی دادی کو خواب میں کہا گیا کہ تم نے سلطان مظفر کو شراب کیوں پلائی۔ ان کی دادی پر اس قدر کپکپی طاری ہوئی کہ انھوں نے بیدار ہو کر توبہ و استغفار کی۔ سلطان ہمیشہ باوضو رہتا تھا۔ اقبال نے سلطان کے اسی زہد و تقویٰ اور شعائرِ اسلام میں محتاط روش کو پسند کیا اور اس کو اپنی نظم میں عیاں کیا۔

اس کتاب کے دوسرے دو اہم مقالات میں سب سے اہم 'کلامِ اقبال میں رومی فارسی کی شعری تلمیحات' اور 'اقبال، ڈاکٹر علی شریعتی کی نظر میں' ہیں۔ مؤخر الذکر مقالہ دراصل ڈاکٹر علی شریعتی کے فارسی مقالہ 'ما و اقبال' کا ملخّص ہے۔ ڈاکٹر یزدانی نے 'ما و اقبال' سے تلخیص کرتے وقت غیر متعلقہ مباحث حذف کر دیے ہیں، اب یہ زیادہ مربوط اور بہتر مقالہ ہو گیا ہے اور حشو و زوائد سے پاک ہے۔ ڈاکٹر شریعتی نے اقبال کے حضور جو شاندار خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور اقبال کی فکر کا جو خاطر بیان کیا ہے، وہ تفہیمِ اقبال میں بڑا ہی معاون ہے۔ 'شعری تلمیحات' میں اقبال پر رومی کے اثرات ظاہر و باہر ہیں۔ مرشد کے افکار کا باطنی اور اس کے شعری اسالیب کا ظاہری پرتو، دونوں اقبال پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی کی کتاب 'اقبال کے شعری ماخذ'، نذیر احمد کی 'تشبیہات و

استعاراتِ اقبال'، ڈاکٹر اکبر حسین قریشی کی 'مطالعۂ تلمیحات و اشاراتِ اقبال' اور سید عابد علی عابد کی 'تلمیحاتِ اقبال' اس سلسلے میں بڑی وقیع کتب ہیں لیکن ڈاکٹر یزدانی کا یہ مقالہ اپنے اختصار اور جامعیت کے حوالے سے بہت اہم ہے؛ تاہم یہ موضوع ابھی تحقیق کے لیے اور پھیلاؤ چاہتا ہے۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ مختلف کتب پر تبصروں اور جائزوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ڈاکٹر سلیم اختر کی 'اقبال ممدوحِ عالم'، محمود نظامی کی 'ملفوظاتِ اقبال' جو ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے مرتب کی، اور ان کی اپنی کتاب 'اقبال اور مسلکِ تصوف'، عبداللہ قریشی کی 'حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں' اور انھی کی دو دیگر کتب 'روحِ مکاتیبِ اقبال' اور 'اقبال بنام شاد' پر تبصرے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ محترم پروفیسر محمد منور، ناظم اقبال اکادمی کی کتاب 'میزانِ اقبال' پر تبصرہ ہے۔ یہ تبصرے بڑے عمدہ، جامع اور وقیع ہیں۔ عبداللہ قریشی کی تین کتب پر ڈاکٹر یزدانی کا تبصرہ ایک خاموش ماہرِ اقبالیات کی خدمات کا اعتراف سمجھنا چاہیے۔ پروفیسر محمد منور صاحب کی 'میزانِ اقبال' پر تبصرہ اس لحاظ سے اچھا ہے کہ ڈاکٹر یزدانی نے پروفیسر صاحب کے 'میزانِ اقبال' میں شامل متعدد مقالات کا مختصر تعارف کرا دیا ہے اور ڈاکٹر یزدانی کی یہ رائے بڑی معتبر ہے کہ 'میزانِ اقبال' بے حد دلچسپ اور مطالعۂ اقبال کے لیے ایک مفید ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

All rights reserved. ©2002-2006

علامہ اقبال مزار سلطان ٹیپو پر

©2002-2006

مِلّتِ بَیضا پر عمرانی نظر

تبصرہ : ڈاکٹر وحید عشرت

تدوین ـــــــــ ڈاکٹر منظر عباس

ناشر ـــــــــ مکتبہ عالیہ ۔ لاہور

قیمت ـــــــــ ۴۰/ روپے

علامہ اقبال کے ۱۹۱۰ء کے علی گڑھ کے خطبے کو جو "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے نام سے معروف ہے، بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ اصل خطبہ تو انگریزی میں تھا مگر انگریزی اصل سے زیادہ اردو ترجمہ مشہور رہا جو مولانا ظفر علی خان مرحوم نے کیا تھا۔ یہ ترجمہ پمفلٹ کی شکل میں بھی اور مقالاتِ اقبال کے متعدد مجموعوں میں بھی شامل ہے ۔ مگر علامہ کے اس یادگار خطبے کے سلسلے میں عجیب وغریب بات یہ ہے کہ اس کی انگریزی اصل گم ہوگئی، اور جب ایک اخباری نمائندے نے علامہ اقبال سے پوچھا کہ جناب وہ خطبہ کہاں ہے تو آپ نے فرمایا میرے پاس اس کی کوئی کاپی نہیں ہے اور وہ گم ہو چکا ہے ۔

کافی عرصہ قبل اقبالیات کے محقق ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اس کو بالآخر ڈھونڈ نکالا اور اسے اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے میں شامل کیا۔ بعد میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کے مجلّہ 'تحقیق' میں بھی اپنے پیش لفظ کے ساتھ چھپوا دیا۔ اس طرح یہ تقریر پہلی بار اکتوبر ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی ۔ پھر جب ڈاکٹر ہاشمی کا مقالہ اقبال اکادمی سے ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تو یہ تقریر اس میں موجود تھی۔ اس طرح بذاتہٖ یہ تقریر اب کوئی گم شدہ چیز نہ رہی تھی بلکہ متعدد ماہرین اقبالیات نے اس کے حوالے اپنے مقالات میں دیئے ہیں ۔

اب حال ہی میں لاہور کے ایک ممتاز ناشر ادارے مکتبہ عالیہ لاہور نے مولانا ظفر علی خان کے ترجمے کے ساتھ یہ انگریزی متن نہایت خوبصورتی کے ساتھ دوبارہ شائع کیا

ہے۔ ڈاکٹر مظفر عباس اس کے مرتب اور مدوّن کار ہیں جبکہ ڈاکٹر محمد معروف نے اس کا دیباچہ تحریر کیا ہے۔ تاہم اس کتاب میں کہیں مذکور نہیں کہ یہ مقالہ قبل ازیں کہاں کہاں شائع ہو چکا ہے بلکہ یہ تاثر دیا گیا ہے جیسے یہ انگریزی متن بھی پہلی بار شائع ہوا ہے جو ایک نادرست امر اور دیانت داری کے منافی تاثر ہے۔ ڈاکٹر مظفر عباس کے لیے لازم تھا کہ وہ ڈاکٹر ہاشمی کی تحقیق کا کھلے دل سے اعتراف کرتے اور اس کا باقاعدہ حوالہ دیتے۔ اب یہ بات بھی نہیں کہی جاسکتی کہ انہیں یہ بالکل معلوم نہ تھا اس لیے کہ اقبالیات پر تحقیق کرنے والے کی یہ لاعلمی بجائے خود ایک افسوس ناک بات ہے۔

مکتبہ عالیہ اور ڈاکٹر مظفر عباس پہلے بھی "عجائباتِ فرنگ" کے ضمن میں اسی طرح کی ایک ناخوشگوار تلخی سے وابستہ رہے ہیں جب یہ بحث بڑی زوروں سے چلی تھی کہ "عجائباتِ فرنگ" کی تدوین و تحقیق کا اصل سہرا ڈاکٹر تحسین فراقی کے سر بندھتا ہے یا ڈاکٹر مظفر عباس کے سر۔ تو نتیجہ سوائے ایک افسوس ناک علمی سر پھٹول کے کچھ نہ نکلا تھا۔ اس نئے شاخسانے کے ڈانڈے بھی شاید اسی سے ملتے ہوں مگر اہلِ تحقیق کے نزدیک یہ دو نادان بچوں کی سی لڑائی تھی جس کا دائرہ اب ڈاکٹر مظفر عباس نے اور وسیع کر دیا ہے۔

معلوم نہیں علامہ اقبال کے خطبے کے اردو اور انگریزی متن کی یکجا اشاعت سے تحقیق کی دنیا میں کیا انقلاب برپا ہوگا۔ اگر ڈاکٹر مظفر عباس، ڈاکٹر ہاشمی کی اولیت اور محنت کا اعتراف کر لیتے تو یہ دونوں کے لیے البتہ ایک اعزاز کی بات ہوتی۔ ویسے اقبالیات کے طلبہ کے لیے اردو اور انگریزی متنوں کی یکجا اشاعت مفید بات ضرور ہے۔

اس کتاب میں حواشی کی جو ایک گنجائش موجود تھی، ڈاکٹر مظفر عباس نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا، صرف تین حواشی دیے ہیں جو ناکافی ہیں۔ اس خطبے کے حوالے سے چند اہم سوالات ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے شاید عجلت پسندی یا سہل انگاری کے سبب اس ضمن میں محنت نہیں کی، حالانکہ اس طرح کی عجلت پسندی علمی معاملات میں محقق کو غیر معتبر بنا دیتی ہے۔ اس خطبے میں ایک حاشیہ دیا گیا ہے جو قادیانیوں کے بارے میں علامہ نے خود اپنے ہاتھ سے تحریر کیا۔ اسے تو خطبے کے متن میں شامل سمجھا جانا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر عباس اس پر خود حاشیہ لکھتے کہ علامہ نے کیوں اس خطبے میں قادیانیوں کے طرزِ عمل کی تعریف کی اور بعد میں اس سے برأت کا اظہار کیا۔ ظاہر ہے کہ اس خطبے کے وقت مرزا غلام احمد قادیانی نے قطعی اور حتمی طور پر دعوائے نبوّت

نہیں کیا تھا۔ وہ خود کو مجدد، مصلح اور مناظرِ اسلام کہتے تھے۔ ایسے میں ان کے اور ان کی جماعت کے اسلامی کردار کی اقبال نے تعریف کی مگر جب مرزا صاحب نے پَر پُرزے نکالے اور نبوت کے دعوے شروع کیے تو اقبال ان اولین لوگوں میں سے تھے جنھوں نے ان کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ تکفیر کی اور ۱۹۳۵ء میں انتخابات کے وقت انہیں اس لیے غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا کہ یہ کشمیر اور پنجاب کو قادیانی ریاست میں بدلنے میں ناکام ہو کر خود الیکشن کے ذریعے مسلمانوں کی نشستوں پر منتخب ہونے اور پاکستان کی تحریک کو سبوتاژ کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

بہر حال یہ خطبہ مزید تحقیق اور تدوین چاہتا ہے جو اس سارے کام میں موجود نہیں ہے۔ البتہ اقبالیات کے طلبہ کے لیے ان دونوں متون کی یکجا اشاعت کسی قدر مفید ہے۔ خدا کرے کہ مکتبہ عالیہ اور ڈاکٹر منظفر عباس اقبالیات کے ضمن میں اس سے بھی بڑھ کر اچھے کام کریں اور اپنی مساعیِ جمیلہ کے ذکر کے ساتھ دوسروں کی تحقیق اور محنت کی بھی حوصلہ افزائی سے کام لیں تو اس سے ان کے اپنے وقار میں اضافہ ہو گا۔

462

علامہ اقبال جامعۃ الازہر قاہرہ کے وفد کے ساتھ لاہور ۱۹۳۷ء

جستجو

تبصرہ: ڈاکٹر وحید عشرت

مصنف ——— ڈاکٹر تحسین فراقی

پبلشرز ——— یونیورسل بکس

۴۔ اردو بازار لاہور

قیمت ——— ۴۵/- روپے۔ صفحات ۲۳۹

ڈاکٹر تحسین فراقی ان چند نقادوں میں سے ہیں جنھوں نے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ علمی دنیا میں اپنا مقام بنایا ہے اور اردو تنقید میں اسلامی نقطۂ نظر کے حوالے سے اپنی پہچان کرائی ہے۔ اسلامی ادب کے حوالے سے تنقید کا کام بہت تھوڑا ہوا ہے۔ اور جو ہوا بھی ہے، اس میں بھی اتنی جان نہیں کہ اسے تنقید کہا جا سکے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اسلامی نظریۂ ادب کی تنقید میں نمائندگی اپنی کتاب "جستجو" کے ذریعے کی ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کی کتاب "جستجو" اس حوالے سے تو بڑی اہم ہے کہ اس پر ہماری علمی دنیا کے چند ممتاز اصحاب کی رائے درج ہے؛ تاہم میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر تحسین فراقی کا فکری اور ذہنی سفر اس کتاب سے آگے بڑھ چکا ہے، لہٰذا "جستجو" ڈاکٹر تحسین فراقی کی تنقید میں، ایک ابتدائی کتاب شمار کی جانی چاہیے، ڈاکٹر تحسین فراقی کا اس کتاب سے جائزہ لینا چاہیے، اس لیے کہ "جستجو" کے حوالے سے ڈاکٹر تحسین فراقی کو پرکھنا ان کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہوگا۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اس کتاب میں بڑے ہی متنوع موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جن میں اردو ادب میں اسلامی اقدار کی پیش کش کا مسئلہ، اردو تنقید کے دس سال، چھمائی اور اس کی شاعری، علامہ اقبال اور ثنائے خواجہ، اقبال اور ابوالعلا المعری اور چند مماثل پہلو، اکبر الٰہ آبادی، محمد حسن عسکری، جدیدیت اور بشنو از نے چوں حکایت مے کند شامل ہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ جناب سراج منیر نے لکھا ہے جو بہت فکر انگیز ہے اور ڈاکٹر تحسین فراقی سے ان کی

محبّت کی عکاسی کرتا ہے۔ جناب سراج منیر سے خود یہ خواہش کی جا سکتی ہے کہ وہ اس دیباچے میں بیان کردہ چند اہم اصولوں کے تناظر میں ادبی تنقید کا آغاز کریں۔ اردو تنقید یقیناً کھلے دل سے ان کا خیر مقدم کرے گی، اور میرے خیال میں سراج منیر صاحب کا تنقیدی ذوق اردو تنقید میں ایک منفرد اسلوب کو جنم دینے کا باعث ہو گا کیونکہ اردو تنقید کو معتبر مقام دلانے کے لیے پختہ کار، کم متعصب اور علمی دنیا میں وسعتِ نظر رکھنے والے تنقید نگاروں کی اب بھی بڑی ضرورت ہے۔ کم متعصب میں نے اس لیے کہا ہے کہ غیر متعصب کوئی بھی نہیں ہوتا، ہم یا تو زیادہ متعصب ہوتے ہیں یا کم متعصب ہو سکتے ہیں، اور انسان کے لیے یہی ممکن ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کم متعصب ہو۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ ایک ایسے نقّاد کو جو ادبی تنقید کے میدان میں کسی خاص نقطۂ نظر کے تحت، پہلی بار اتر رہا ہو، اس کو وہ اصول اعتقاد بھی بیان کرنا چاہیے جس کو اس نے اپنی تنقیدی اپروچ میں تمام زور کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اپنا تنقیدی زاویۂ نگاہ اور اسلوب اگر کسی کتاب کے آغاز میں بیان کر دیا جائے تو اس کتاب کو پڑھنے والا آسانی کے ساتھ اس ساری فضا کو سمجھ سکتا ہے جو اس کے زاویۂ اظہار کی تعمیر کرتی ہے۔ اس سے تنقید کے ان معیارات کا پتہ چل جاتا ہے جن پر کوئی نقّاد اپنا مقدمہ تیار کرتا ہے۔ اگر یہ تنقیدی زاویۂ نگاہ اور تنقید کے معیارات متشخص نہ ہوں تو اس سے تنقید نگار کے بارے میں مختلف طرح کی بدگمانیاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور خود اس تنقید کا قاری اپنے نقّاد کی پراگندہ خیالی کے ساتھ سفر کرتا رہتا ہے اور کسی قطعی نتیجے پر پہنچنے کے بجائے فکری ژولیدگی میں گرفتار ہو جاتا ہے، کیونکہ قاری کو مصنف یا نقّاد کی تحریر سے اس کا نقطۂ نظر سمجھنے میں بالآخر کامیابی تو ہو جاتی ہے مگر اس میں بسا اوقات یہ دقّت ہوتی ہے کہ وہ نقطۂ نظر اپنے پورے تناظر کے ساتھ اس کی گرفت میں نہیں آتا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کا تنقیدی رویہ اردو ادب میں اسلامی اقدار کی پیشکش کا مسئلہ تو متعین کرتا ہے مگر یہ مضمون چونکہ کچا اور تشنہ ہے، لہٰذا اس کے مطالعے کے بعد تشنہ کامی اور بڑھ جاتی ہے۔ ڈاکٹر تحسین کے موقف کے برعکس جب ہم دوسرے اسلامی ادب کے تنقید نگاروں کو دیکھتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی ادب والے کسی فن پارے کو کس معیار پر پرکھتے اور وہ ایک فن پارے سے کیا توقع کرتے ہیں۔ کیا وہ بھی اشتراکی نظریہ بازوں کی طرح ادب کو پروپیگنڈے کی کٹھالی میں ڈھالنا چاہتے ہیں اور فن کار کو عقیدہ پرستی کی اذعانیت کے غار میں بند کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اس کے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے یا ان کے نظریہ کے حصار میں تخلیق کار کا خلاق ذہن صرف اپنی سمتِ فکر ہی متعین کرنے پر اکتفا کرے۔ ان کے تخلیقی رویّوں اور اظہار کے پیرایوں پر کوئی قدغن نہیں لگتی۔

اشتراکیت گزیدگی اور ترقی پسندی کے نام پر سوشلزم استعماریت کی غلامی کا پٹہ گلے میں لٹکائے رکھنے پر اصرار کرنے والے ادیبوں کے متشدد رویے سے فن کار اور تخلیق کار پہلے ہی سہما ہوا ہے۔ یہی رویہ اگر اسلامی نظریے کے حامیوں کو اختیار کرنا ہے تو فن کار اور تخلیق کار کے لیے سوائے خوف و ہراس کے اور کیا احساس رہ جاتا ہے۔ لہٰذا اسلامی نظریے کے علمبرداروں کا فرض ہے کہ وہ تخلیق کاروں کو تخلیق کی آزاد فضا مہیا کرنے کے لیے اپنے ہاں کسی وسعت کا احساس دلائیں اور اسلامی نظریے کو اذعانیت سے پاک کر کے اسے خلاق رویے سے تعبیر کریں تاکہ فن کار اسلامی مابعد الطبیعیاتی اور تمدنی فضا میں اپنی آزاد اور خلاق فطرت کے اظہار کے امکانات سے تسکین پا سکے۔ اسلامی ادب کے علمبرداروں کو اشتراکی نظریہ بازوں سے عبرت پکڑنی چاہیے اور فن کار کو ایک وسیع تخلیقی زمین فراہم کرنی چاہیے۔ ہر وہ فن پارہ اسلامی ادب کا حصہ ہو جس کی فکری بُنت اسلام کے نظریۂ توحید کی مابعد الطبیعیاتی فضا سے معمور ہو، خواہ اس کی لفظیات، اسلوب اور موضوع کوئی سا بھی ہو۔ اس وسعت سے ہم غیر مسلموں کے ادب میں بھی اسلامی ادب کا سراغ لگا سکیں گے اور اس وسعتِ نظر سے تخلیق کار کو بھی کھلی فضا میں سانس لینا نصیب ہو گا۔ اسلامی ادب کوئی خاص گروپ یا جماعت کے تخلیق کاروں کی نوجِ ظفر موج تک محدود تصور نہ کر لیا جائے بلکہ پورے ادبی اور تہذیبی سرمائے میں اس کی شناخت کی جائے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کو لازم تھا کہ وہ ایک خاص دبستانِ ادب کا تنقیدی معیار متعین کرتے وقت اس معیار کی حدود و قیود کا بھی سراغ دیتے۔ پھر یہ بات تو درست ہے کہ اخلاقی اقدار قطعی ہوتی ہیں۔ ہر جگہ اور ہر زمان میں ان کا پیمانہ اور مفہوم ایک ہی ہوتا ہے۔ مسئلہ در اصل اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ اخلاقی اقدار اطلاقات پاتی ہیں۔ اطلاقات میں ان کے مفاہیم میں تغیرات کی نوعیتیں کیا ہیں، مسئلہ تو اصل میں یہ ہے جب خیر کا تصور ایک صورتِ حال میں کچھ ہے تو دوسری اطلاقی کیفیت میں کچھ اور ہو جاتا ہے۔ اخلاقیات میں جب خیرِ اعلیٰ ہی کا مفہوم متغیر رہتا ہے تو دوسری اخلاقی اقدار کے اطلاقی مفاہیم میں تغیرات بھی لازم ہیں۔ اخلاقی اقدار اپنی اصل میں تو متعین اور ابدی ہیں مگر اپنے اطلاقی مفہوم میں وہ بھی اضافی ہو جاتی ہیں اور زماں و مکاں کی حدت اس پر بھی اثر مرتب کرتی ہے ـــــ در اصل کسی قدر کے مفاہیم کا تعین بھی درپیش انسانی صورتِ حال کے تناظر ہی میں کیا جا سکتا ہے۔

میرے نزدیک "جستجو" میں سب سے اہم مقالہ اردو تنقید کے دس سال ہے جو بڑی ہی محنت اور جانفشانی سے لکھا گیا ہے۔ میری طرح اس مقالے سے کوئی قاری ہر ہر قدم پر ڈاکٹر

تحسین سے اختلاف کر سکتا ہے، مگر ڈاکٹر تحسین نے اس سلسلے میں جو محنت کی ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس تبصرے میں بھی گنجائش نہیں کہ ان کے مقالے پر بات کی جائے؛ تاہم اردو تنقید کے ہر سنجیدہ قاری کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا ہوگا۔ اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب وہیں غیر متوازن ہوئے ہیں، جہاں انہیں اسلامی ادب کی رعایتوں کو مدِ نظر رکھنا پڑا ہے، جہاں ان کا تنقیدی اسلوب ایک محدود دائرے میں گردش کرنے لگتا ہے۔ اور پھر اس سے باہر کا دروازہ انہیں مقفل نظر آتا ہے۔ اس سے ہٹ کر جہاں خود تنقید نگار ان کے اندر سے بولتا ہے، وہاں ان کے ہاں بڑی پختگی اور نیا پن پایا جاتا ہے۔

ان کے، علامہ اقبال کے حوالے سے، دو مقالات "علامہ اقبال اور ثنائے خواجہ" اور "اقبال اور ابو العلا المعری" بہت عمدہ ہیں۔ علامہ اقبال کی آنحضرت صلعم سے محبت کے شواہد انہوں نے بڑی محنت سے فراہم کیے ہیں اور علامہ اقبال کے فنافی الرسولؐ ہونے پر بڑی معتبر گفتگو کی ہے۔ پھر اقبال کی نعت گوئی پر بھی توجہ دلائی ہے کہ وہ کس طرح آج کے نعت گو شعراء کے لیے اسبابِ فیض بنی ہے۔ اقبال کے تصورِ خودی اور فردِ مصدقہ یا مردِ مومن کا تصور میرے نزدیک حضور صلعم کی ذات سے مستخرج ہوا ہے، اور اقبال کے مردِ مومن اور فردِ مصدقہ کی، اطلاقی دنیا میں، تفسیر و تعبیر اپنی اکمل ترین صورت میں صرف اور صرف آپؐ ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کا اقبال پر دوسرا مقالہ "اقبال اور ابو العلا المعری" تحقیق کا عمدہ نمونہ ہے اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے سرقہ اور توارد کا امتیاز عمدگی سے روا رکھا ہے، ورنہ کم ظرف تو توارد پر بھی سرقے کا لیبل لگا دیتے ہیں۔ یہ مقالہ اقبال کے ساتھ ساتھ ابو العلا معری کو سمجھنے میں بھی معاون ہے۔

اکبر الہ آبادی پر ان کا مقالہ دراصل ڈاکٹر پروفیسر خواجہ محمد زکریا کی کتاب پر ایک تعارفی مضمون ہے اور اس لحاظ سے یہ بڑا کامیاب ہے کہ انہوں نے اس کتاب کے مندرجات اور موضوعات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ متعارف کرایا ہے۔ اسے تنقیدی مضمون سمجھ کر نہ انہوں نے لکھا ہے اور نہ قارئین کو یہ تاثر دیا ہے۔ اسی طرح "بشنو از نے چوں حکایت می کند" والے مقالے میں انتظار حسین پر تنقید سے زیادہ ان سے ان کی محبت اور مروّت میں غلو کا رویّہ غالب ہے۔ اگر مجھے ان کے اس پہلو کا یقین نہ ہوتا تو میں سمجھتا کہ وہ انتظار حسین کو نہیں سمجھے، اس لیے کہ خود انہوں نے انتظار حسین کا جو اقتباس دیا ہے، وہ ان کی پوری فکر کو منعکس کرتا ہے۔ لیجیے! آپ بھی پڑھیے۔ انتظار حسین کے افسانے کا ایک کردار (بچہ) اپنے باوا سے کہتا ہے:

"باوا! پاکستان میں چل کر قطب کی لاٹھ دیکھیں گے۔"

"بیٹا! قطب صاحب کی لاٹھ پاکستان میں نہیں ہے، وہ تو دلّی میں ہے۔"

"اچھا بابا! تاج بی بی کا روضہ دیکھیں گے۔"

"لے تاج بی بی کا روضہ آگرہ میں ہے۔"

"تو باوا! پاکستان میں کیا ہے؟"

"بیٹا! پاکستان میں قائداعظم ہیں۔"

اب اس اقتباس میں انھوں نے جس انداز سے یہ بات باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ہماری تہذیب، ثقافت اور ادب ہر چیز بھارت میں رہ گئی ہے اور پاکستان میں سوائے قائداعظم کے کچھ نہیں، اس کو تحسین فراقی صاحب گرفت میں نہیں لاسکے۔ تحسین صاحب محبت کے مارے ہیں۔ وہ انتظار صاحب کی مہاجرت کی سند حضورؐ کی مہاجرت سے لاتے ہیں، حالانکہ حضورؐ نے کعبہ کی وجہ سے مکہ کو عزیز کہا تھا اور کعبہ جیسے مقدس مقام کے ہوتے ہوئے بھی اُسے چھوڑ دیا۔ ایک اصول اور نظریے کی خاطر ___ انتظار صاحب 'نیم کے پیڑ' کی خاطر اپنے نظریے کو دو نیم کر دیتے ہیں۔ ہم ان سے افسانوں میں پاکستان کا جغرافیہ نہیں مانگتے مگر وہ اپنے افسانوں میں کسی اور ملک کے جغرافیے میں بھی تو بسر نہ کریں۔ اس لیے کہ ماضی سے تعلق اور رشتہ تخلیقی سطح پر نہ ہو تو ماضی بھی ایک بُت بن جاتا ہے جسے انسان لاشعوری طور پر پوجتا رہتا ہے۔ اور وہ انسان کے کسی تخلیقی تجربے میں ڈھل کر حال اور مستقبل کی تعمیر میں معاون ہونے کے بجائے ایک روحانیت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ماضی سے کٹنے کا رویّہ بھی درست نہیں تو ماضی کی بے روح لاش سے چمٹے رہنے سے بھی زندگی منظرِ عام نہیں ہو سکتی۔ ادب، جو اظہار کے تخلیقی سوتوں سے عبارت ہے اس میں ماضی ہمارے حال اور مستقبل کو متعین کرنے میں ایک حوالہ ہونا چاہیے۔ ماضی کی لاش پر ماتم کرنے والا مرثیہ نہیں بننا چاہیے، اس لیے کہ مرثیہ گوئی کوئی تخلیقی رویّہ نہیں۔ پھر کوئی سیاست دان، فن کار اور ادیب اپنے مابعد الطبیعیاتی نظریے اور حوالے کی نفی کر کے بڑا نہیں بن سکتا، اس لیے کہ اپنے وجود کی نفی کرنا تہذیبی اور ثقافتی خودکشی سے عبارت ہے؛ تاہم وہ اس کا دھارا کسی اور مثبت رُخ پر موڑ سکے تو اس میں اس کی عظمت کا جوہر پوشیدہ ہے۔ انتظار حسین کی مقبولیت کا سارا راز کہانی کی بُنت، ہیئت اور زبان کی چاشنی میں ہے۔ ان کا تہذیبی، ثقافتی اور فکری دائرہ خود ان کی خلاق صلاحیتوں کے لیے سمِ قاتل ہے۔ اگر انتظار حسین اس کا ادراک رکھتے تو شاید وہ اُردو زبان

ہی نہیں، دنیا کے چند اہم افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ——— ان کا اندازِ تفلسف ان کے اندر کے ایک بڑے کہانی کار کو پچھاڑ چکا ہے۔

محمد حسن عسکری کے بارے میں ڈاکٹر تحسین فراقی کا مقالہ ان کے تعارف کے سلسلے میں اچھی کوشش ہے؛ تاہم یہ محض جدیدیت کے حوالے ہی سے لکھا گیا ہے، اور یہ تنقیدی مقالہ تو ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا، البتہ تعارفی مقالہ کہا جا سکتا ہے اور اس حوالے سے یہ بڑی کامیاب کاوش ہے۔ محمد حسن عسکری ابھی تک مکمل طور پر سمجھے نہیں گئے؛ اور ان پر ابھی کام کی ضرورت ہے۔ وہ ہماری علمی اور ادبی تنقید میں اہم شخصیت ہیں؛ تاہم تحسین فراقی صاحب کا مقالہ اس سلسلے میں تحریک ضرور دیتا ہے۔

بحیثیتِ مجموعی "جستجو" ایک معلومات افزا تنقیدی کتاب ہے۔ اس کتاب سے صرف یہی پتہ لگتا ہے کہ اس کتاب کے اندر مستقبل کا ایک بڑا تنقید نگار موجود ہے؛ تاہم اس کے لیے انہیں اپنی وابستگیوں کے تنگ دائرے سے ذرا سا اوپر اٹھنا پڑے گا اور تنقید کی کسوٹی اپنے نظریے اور ادب و فن کو بنانا ہوگا، کسی گروہی اور جماعتی نقطۂ نظر کو نہیں۔ تنقید میں اپنوں اور غیروں کا امتیاز نہ ہونا چاہیے۔ دونوں کو ایک ہی معیار پر رکھیں تاکہ توازن بھی رہے اور جانب داری کا الزام بھی سر نہ آئے کیونکہ فکر و فن میں جانب داری سے کسی کا بھی بھلا نہیں ہوتا، لوگ جانب داری کرنے والے پر مسکراتے ہیں!

All rights reserved ©2002-2006

تقاریر و نگارشات

قائدِ ملّت نواب بہادر یار جنگ

تبصرہ : محمد اصغر نیازی

ترتیب و تدوین ـــــ محمد احمد خاں و مجید احمد فاروقی

ناشر ـــــ بہادر یار جنگ اکادمی بہادر آباد کراچی

قیمت ـــــ سو روپے، سفید کاغذ، پیپر بیک، صفحات ۳۵۲

یہ بات بے حد مستحسن اور لائقِ تقلید ہے کہ علم و دین کے کچھ پرستاروں نے تحریکِ آزادی کے ایک نامور سپوت کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ تشکیل دیا ہے اور نواب بہادر یار جنگ کی تقاریر پر مشتمل ایک کتاب چھاپ کر نوجوان نسل کو اُن کے رُوبرُو کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ جو کچھ وہ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکے، پڑھ کر دیکھ لیں اور جو کچھ اپنے کانوں سے نہیں سُن سکے، اپنے دل کے کانوں سے سُن لیں۔ پھر اگر انہوں نے اس کا عشرِ عشیر بھی پا لیا جو نواب بہادر یار جنگ کے مخاطبین نے پایا تھا تو بس یوں سمجھیے اس خوبصورت کتاب کی اشاعت کا مقصد پورا ہو گیا۔

اس سلسلے میں مولانا غلام محمد رکن مجلسِ تاسیس کی مساعیِ جمیلہ بطورِ خاص لائقِ صد تحسین ہیں جو اکادمی کے مطبوعاتی شعبے کی ترقی اور توسیع کے لیے گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں ــــ اس کا ایک جیتا جاگتا ثبوت زیرِ نظر کتاب ہے جس کی معنوی خوبیاں تو ہیں ہی، اس کی صُوری خوبیاں بھی اکادمی کی نیک نامی اور کامیابی کے لیے ایک ضمانت ہیں۔

کتاب کا نام "تقاریر و نگارشات" ہے جو لسان الامّت قائدِ ملّت نواب بہادر یار جنگ کی زبان و قلم سے نکلیں اور برِصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں اُتر گئیں اور انہیں اس قدر گرمایا اور تڑپایا جیسے اُن میں پاکستان قائم ہو گیا۔ کاش وہ کوئی دن اور زندہ رہتے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ جو ملک انہوں نے برِصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں بسایا تھا، دنیا کے نقشے پر کیسے اُبھرا!

نواب بہادر یار جنگ نے بہت مختصر زندگی پائی لیکن اس کم عرصے میں وہ ہند و پاک کے

مسلمانوں کے سامنے ایک مفسّرِ قرآن، مبلّغِ اسلام اور نظریۂ پاکستان کے عظیم ترجمان کے روپ میں جلوہ گر ہوئے۔ برِّ صغیر کے لوگ انہیں ایک شعلہ بیان خطیب اور مدبّر سیاست دان کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

نواب صاحب، قائدِ اعظم محمد علی جناح کے رفیقِ کار اور مدّاح ہی نہیں تھے، بلکہ ایک عاشقِ صادق بھی تھے۔ وہ کہا کرتے تھے، اور یہ بات انہی کے منہ سے اچھی لگتی ہے کہ "اِس جوان نے اگر کسی سے عشق کیا ہے تو وہ بھی ایک بوڑھے ــــ جناح ــــ سے"۔ زیرِ نظر کتاب میں بھی قائدِ اعظم کے بارے میں نواب صاحب کی دو تحریریں شامل ہیں جو قائد سے نواب کے قلبی لگاؤ کی آئینہ دار ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ نواب صاحب کا علامہ اقبال سے بھی تھا۔ اسی کتاب میں 'اقبال کا پیامِ آزادی' کے نام سے اُن کی ایک شاہکار تقریر زیبِ اشاعت ہے جس کے مد و جزر اور زیر و بم کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ علامہ اور نواب صاحب کے خیالات اور جذبات میں کس قدر ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ دونوں کے دل اُمّتِ مسلمہ خصوصاً برِّ صغیر کے مسلمانوں کی دِگر گوں حالت پر ایک ساتھ تڑپتے تھے۔ اقبال نے فرمایا تھا "شاعر سینۂ ملّت میں دل کی مانند ہے"۔ نواب صاحب کی ولولہ انگیز خطابت سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس دل کی دھڑکن کی مانند تھے۔ اقبال کا کہنا ہے ؎

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے کیا جانیے کس کی ہے یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی، دل محفل کا تڑپا بھی گئی

نواب صاحب کی تقاریر ایک نظر دیکھ جائیے، آپ کو یہ خیال ضرور آئے گا کہ لبِ اقبال سے نکلنے والی یہ صدا نواب بہادر یار جنگ کی بھی ہو سکتی ہے ــــ پاکستان، زندہ باد!

تقریر، دیکھ کر سننے اور سُن کر محسوس کرنے سے تعلّق رکھتی ہے۔ سامعین اور مقرّر، دونوں کی کوشش ہوتی ہے کہ یہ تعلق کسی لمحے ٹوٹنے نہ پائے، لیکن یہی تقریر جب کتابی شکل میں سامنے آتی ہے تو اُسے محض ایک مضمون کی طرح پڑھا جاتا ہے، اور تقریر کو اس طرح پڑھنے سے وہ سبھی کچھ غائب ہو جاتا ہے جس کے ہونے سے کبھی کبھی ہی سہی، بقولِ غالب یہ کہا جا سکتا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

تقریر اور تحریر کی وضع قطع اور ساخت و پرداخت میں اس قدر فرق ہے کہ ایک کا لباس دوسری پر کم ہی ٹھیک بیٹھ سکتا ہے۔ بار ہا ایسا ہوا کہ ایک ولولہ انگیز مقرّر کی تقریر کے قارئین یہ کہتے

پاسنے گئے ہے

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

میں یہ جملۂ معترضہ صرف اس لیے لکھ رہا ہوں کہ نواب صاحب کی تحریک ساز تقریروں کے قارئین یہ بات ذہن میں رکھ کر انہیں پڑھیں کہ وہ اُن کے قارئین نہیں بلکہ سامعین ہیں۔ کاش وہ اُن کے سامعین ہوتے تو ایک ہی بار میں سمجھ جاتے کہ قائدِ اعظم جنہوں نے اپنی موجودگی میں کبھی کسی مقرر کو طویل تقریر کرنے کی اجازت نہ دی، فوراً قائدِ اعظم اپنے سامنے سے گھڑی اور گھنٹی اٹھوا دیتے اور اعلان کرتے اب نواب بہادر یار جنگ تقریر کریں گے، اور نواب صاحب زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے سٹیج پر نمودار ہوتے

اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

نوجوان نسل کو ایک سچے پاکستانی کی یہ تقریریں اس دور میں لے جائیں گی جب کانگرس کے ایک قومی نظریے کو مسلم لیگ کی قیادت میں برِ صغیر کے مسلمانوں نے دو قومی نظریے سے شکست دے کر پاکستان حاصل کیا۔ کاش نواب بہادر یار جنگ کا جوش و جذبہ ہمیشہ پاکستانی قوم کے دل کی دھڑکنوں میں رہے اور یہ چراغِ مصطفوی بن کر شرارِ بولہبی سے ہمیشہ ستیزہ کار رہے —— بہادر یار جنگ اکادمی کا مشن بھی یہی ہے اور وہ اس کتاب کو چھاپ کر کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہے۔

علامہ اقبال حیدر آباد دکن سے آنے والے طلبا کے ایک وفد کے ساتھ اپنی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں (۱۹۲۹ء)

رسالہ 'اردو' اور 'صحیفہ' میں ذخیرۂ اقبالیات

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006
اقبال سائبر لائبریری

صابر کلوروی

رسالہ "اردو" انجمن ترقی اردو کا وقیع سہ ماہی جریدہ ہے جو ۱۹۲۱ء میں سب سے پہلے اورنگ آباد (دکن) سے شائع ہوا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق اس کے بانی تھے۔ اس رسالے نے ٹھوس ادبی علمی اور تحقیقی مضامین چھاپنے کی طرح ڈالی۔ یہ رسالہ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۶ء تک اورنگ آباد (دکن) سے ہی شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۳۶ء میں مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو کے دفتر کو دلی لے آئے۔ اس نقل مکانی کے بعد یہ رسالہ ۱۹۴۷ء تک دہلی سے شائع ہوتا رہا۔ انجمن ترقی اردو کو ایک دفعہ پھر ہجرت کا مرحلہ درپیش آیا۔ ۱۹۴۸ء میں مولوی عبدالحق کراچی آگئے۔ ۱۹۴۹ء کے وسط میں "اردو" پھر جاری ہوا جو ۱۹۶۱ء میں ان کی وفات تک جاری رہا۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۵ء تک بعض مالی دشواریوں کے باعث یہ رسالہ اپنی اشاعت برقرار نہ رکھ سکا۔ اس دوران میں اس کا صرف ایک شمارہ ۱۹۶۲ء میں شائع ہو سکا جو مولوی عبدالحق کی یاد میں نکالا گیا تھا۔ ۱۹۶۶ء میں اس کا دوبارہ اجراء ہوا اور اب تک بڑی باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

زیر نظر جائزہ رسالہ اردو میں شائع ہونے والے ان مضامین کا ہے جو علامہ اقبال سے متعلق ہیں یہ جائزہ شمارہ ۴ (دسمبر ۱۹۸۵ء) تک کا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال کی وفات کے بعد اس رسالے ایک یادگار شمارہ بیادِ اقبال شائع ہوا۔ بعد میں ۱۹۷۷ء میں اقبال صدی کے موقع پر اس نمبر کو بعض اضافو کے ساتھ دوبارہ چھاپا گیا۔ اس جائزے میں رسالہ اردو کے اقبال نمبر ۷۷ (طبع جدید) سے بھی استفا کیا گیا ہے۔

اس جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ اردو میں اقبال سے متعلق لگ بھگ پچاس مضا شائع ہوئے۔ علامہ کی دو نظمیں ان کی زندگی ہی میں رسالہ اردو میں شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ احمد اور ڈاکٹر سید نعیم الدین اس رسالے میں اقبال پر لکھنے والوں میں نمایاں حیثیت کے حامل رہے

۱۹۲۱ - ۱۹۶۱ء کے درمیان رسالہ 'اردو' میں ذخیرۂ اقبالیات کا جائزہ، اس اشاریے کی مدد سے لیا گیا ہے جو سید سرفراز علی رضوی اور ابو سلمان شاہجہان پوری نے مرتب کیا تھا۔ اور ۱۹۷۶ء میں انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ تاہم ۱۹۶۶ء کے بعد کے تمام شماروں کی ورق گردانی مرتبِ مضمون بذاتے کی۔ راقم الحروف اس ضمن میں انجمن ترقی اردو کے کتب خانۂ خاص کے مہتممین کا شکر گزار ہے۔

ذیل میں رسالہ 'اردو' میں شائع ہونے والے ذخیرۂ اقبالیات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

سہ ماہی 'اردو' کا جائزہ

آفتاب احمد صدیقی، ڈاکٹر		اکبر الہ آبادی اور اقبال	شمارہ ۱، ۱۹۸۱ء، ص ۶۶-۸۹
آل احمد سرور	i	اقبال اور اس کے نکتہ چیں	اکتوبر ۳۸ء، اقبال نمبر ص ۲۴۴-۲۵۴
	ii	اقبال کے خطوط	جنوری ۴۶ء ص ۱۹
ابوظفر عبدالواحد		اقبال کا ذہنی ارتقا	〃
اختر راہی		اقبال کی تصانیف، خود ان کی نظر میں	اقبال نمبر ۷۷ء، ص ۲۴۴-۲۵۸
اسلم فرخی، ڈاکٹر	i	نثرِ اقبال	اقبال نمبر اکتوبر ۳۸ء طبع جدید
〃	ii	〃	جولائی ۱۹۶۶ء ص ۵۹-۶۶
افضل حق قرشی، قاضی		باقیاتِ اقبال	اپریل ۱۹۶۹ء ص ۳۷-۵۴
اقبال، علامہ سر محمد	i	شاعر (قطعہ)	جنوری ۱۹۳۶ء ص ۱۰
	ii	مسعود (مرحوم)، نظم	اکتوبر ۱۹۳۷ء ص ۲۶
اکبر حسین قریشی		اقبال کی بعض نظموں کے مآخذ	جنوری ۶۶ء، ص ۱۴
بشیر احمد ڈار	i	چیست عالم چیست آدم چیست حق	شمارہ ۳، ۱۹۷۴ء ص ۵-۲۱
〃	ii	غالب اور اقبال	اپریل ۶۹ء ص ۸۹-۱۰۴
بشیر الدین احمد سید		اقبال کا تصورِ زمان	اکتوبر ۳۸ء اقبال نمبر ص ۱۰۶
جلیل قدوائی		اقبال کی بعض نظموں کا ابتدائی متن	اکتوبر ۱۹۵۲ء ص ۱۲۰
خان رشید، ڈاکٹر		شاعرِ آگہی	اقبال نمبر ۷۷ء، ص ۳۳-۵۱
ڈینی سن راس		تعزیتی شذرہ	اکتوبر ۳۸ء اقبال نمبر ص ۱۹
رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر		موت اور حیات اقبال کے کلام میں	اکتوبر ۴۰ء ص ۵۱۱
ریاض الحسن ڈاکٹر		کلام اقبال کی زبان	جولائی، اکتوبر ۵۸ء، ص ۳۹۲

ریاض صدیقی		اقبال اور علاج (انکار سے اثبات تک)	اقبال نمبر ۷۷، ص ۲۵۹-۲۶۶
زہریری		کلام اقبال کی زبان	اقبال نمبر ۳۸، طبع جدید، ص ۳۸۱-۳۹۰
عبداللہ، ڈاکٹر سید	i	اقبال کی فطرت نگاری	جولائی ۵۱، ص ۱۰۵
	ii	اقبال کے محبوب فارسی شاعر	جولائی ۴۶، ص ۳۳۹
	iii	اقبال کی تصانیف نظم و نثر میں سائنسی موضوعات	اقبال نمبر ۷۷، ص ۷-۱۳
عبدالحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر		رومی، نطشے اور اقبال	اکتوبر ۳۸، ص ۷۷۹
عبدالحمید قاضی، ڈاکٹر		اقبال کی شخصیت اور اس کا پیغام	اکتوبر ۳۸، اقبال نمبر، ص ۹۳۳
عبداللطیف صدیقی، شیخ		شاعر، اقبال کی نظر میں	اکتوبر ۴۲، ص ۵۱۳
عزیز احمد	i	اقبال کا نظریہ فن	اکتوبر ۳۸، اقبال نمبر طبع جدید ص ۴۰۹-۴۶۰
	ii	"	جولائی ۴۹، ص ۲۸
	iii	"	اکتوبر ۴۹، ص ۱۱
	iv	اقبال اور ارتقائے تخلیقی	جولائی ۴۷،
محمد حسن رضوی، سید		اقبال اور بھرتری ہری	اقبال نمبر ۷۷، ص ۱۳۹-۱۵۹
عابد حسین، ڈاکٹر سید		اقبال کا تصور خودی	اکتوبر ۳۸، اقبال نمبر، ص ۷۳۸
عابد صدیقی		اقبال کے فن کا پس منظر اور اس کا تصور فن	شمارہ ۲۰، ۱۹۸۰، ص ۳۱-۴۲
غلام السیدین، خواجہ		اقبال ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے	جنوری ۴۲، ص ۲۳
غلام حسین ذوالفقار		شبلی کی تاریخ رحلت اور اقبال	اپریل ۶۷، ص ۹۲-۹۴
فرمان فتح پوری		اسرار و رموز کا منظر و پس منظر	اقبال نمبر ۷۷، ص ۵۲-۷۴
کامل القادری		اقبال کا شعور مزاح اور طنزیہ اسلوب	اقبال نمبر ۷۷، ص ۱۶۰-۱۹۲
کشن پرشاد		اقبال کے چند غیر مطبوعہ خطوط	اپریل ۶۷، ص ۸۵-۹۱
ظہیر الدین احمد قریشی دیلوری حکیم		قطعات تاریخ وفات حسرت آیات علامہ اقبال	اکتوبر ۳۸، ص ۷۳۰

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

محمد اسلم، میاں		اقبال اور ملٹن	اقبال نمبر ۷۷، ص ۱۴-۳۲
محمد تقی		اقبال کا تصور زمان و خودی	اپریل ۶۰ء، ص ۱۱۵-۱۲۳
محمد عبدالرشید فاضل سید	i	اقبال اور پاکستان	شمارہ ۱، ۱۹۷۸ء، ص ۶۰-۸۱
	ii	"	اقبال نمبر ۷۷، ص ۷۵-۱۳۸
مشفق خواجہ		علم الاقتصاد: اقبال کا پہلا علمی کارنامہ	جولائی و اکتوبر ۹۰ء، ص ۱۹۱
معین الدین عقیل، ڈاکٹر		تحریک اتحاد اسلامی اور اقبال	اقبال نمبر ۷۷، ص ۱۹۳-۲۴۳
نذیر میرزا برلاس		اقبال اور خوشحال خان	جولائی ۱۹۵۴ء، ص ۸۶
نسیم سید ذوالفقار علی رضوی		اقبال کا نظریہ خودی	اکتوبر ۱۹۴۰ء، ص ۵۶۵
نعیم الدین، ڈاکٹر سید	i	خودی الوہیت اور نبوت	شمارہ ۳، ۱۹۸۲ء، ص ۱۰۵-۱۲۰
	ii	اسلوبی مماثلتیں: رومی اور اقبال	شمارہ ۲، ۱۹۸۲ء، ص ۴۹-۶۶
	iii	رومی و اقبال کا تصورِ عشق	شمارہ ۲، ۱۹۸۱ء، ص ۴-۱۳
نذیر نیازی، سید		علامہ اقبال کی آخری علالت	اکتوبر ۳۸ء، ص ۱۰۱۹
ہاشمی فرید آبادی، سید		تاریخ وفات سر محمد اقبال	اکتوبر ۳۸ء، ص ۷۲۹
یوسف حسین خان	i	اقبال اور آرٹ	اکتوبر ۱۹۳۸ء، ص ۸۳۸

"صحیفہ" لاہور مجلس ترقی ادب کا وقیع ادبی رسالہ ہے۔ اس کا پہلا شمارہ جون ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ سید عابد علی عابد اور سید سجاد رضوی بالترتیب مدیر اور نائب مدیر تھے۔ شمارہ ۸ سے سید قاسم محمود نائب مدیر کی حیثیت سے ادارے میں شامل ہوئے۔ شمارہ ۱۰ سے معاون مدیر کی ذمہ داریاں محمد صدیق کلیم نے سنبھال لیں۔ اکتوبر ۶۷ء میں ڈاکٹر وحید قریشی ایڈیٹر ہوئے۔ مدیر معاون احمد رضا مقرر ہوئے۔ بعد میں جنوری ۶۸ء میں کلب علی خان فائق نے یہ ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے شعبۂ ادارت کے زمانے میں ۱۹۷۳ء میں اس رسالے کا ایک گراں قدر شمارہ بیادِ اقبال شائع ہوا۔ جس میں بعض ایسے مضامین شائع ہوئے جو اب مستقل حوالے کی چیز بن گئے ہیں۔ یہ نمبر دو جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ جنوری، فروری ۷۶ء میں احمد ندیم قاسمی نے ادارت کے فرائض سنبھال لیے۔ کلب علی خان فائق اور یونس جاوید اس کے مدیران معاون مقرر ہوئے۔ بعد میں کلب علی خان فائق اس ادارے سے چلے گئے۔ یونس جاوید بدستور اس کے مدیر ہیں۔

اس دوران میں ۱۹۷۷ء میں دو جلدوں پر مشتمل صحیفہ کا اقبال نمبر (جولائی اکتوبر ۷۷ء) شائع ہوا۔ اکتوبر، دسمبر ۸۲ء، ۸۴ء اور ۸۵ء میں تین اور اقبال نمبر شائع ہوئے۔

زیر نظر جائزے کی ترتیب کے لیے میں مجلس ترقی ادب لاہور کے لائبریری انچارج رحمان صدیقی کے تعاون کا ممنون ہوں۔ اس جائزے میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۵ء تک شائع ہونے والے تمام رسائل شامل ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیفہ میں "اقبالیات" کا گراں قدر ذخیرہ موجود ہے۔ اگر تبصروں کو نکال بھی لیا جائے پھر بھی مضامین کی تعداد تقریباً ۱۰۵ بنتی ہے جو "ماہ نو" کے علاوہ کسی بھی ادبی رسالے میں اقبال پر چھپنے والے مضامین سے کم نہیں ہے۔

افتخار احمد صدیقی، افضل حق قرشی، اکبر علی خان، جسٹس ایس اے رحمان، جابر علی سید، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر سلیم اختر، پروفیسر شریف کنجاہی، پروفیسر صدیق جاوید، ڈاکٹر سید عبداللہ، عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر عبدالغنی، کلب علی خان فائق، ڈاکٹر باقر، محمد حنیف شاہد، ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، محمد عبداللہ قریشی، پروفیسر مرزا محمد منور، ڈاکٹر معین الدین عقیل، میرزا ادیب اور ڈاکٹر وحید قریشی صحیفہ میں اقبال پر لکھنے والوں میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔

ذیل میں علامہ اقبال کے فکر و فن پر اس رسالے میں شائع ہونے والے مضامین کا اشاریہ پیش کیا جا رہا ہے۔

صحیفہ لاہور کا جائزہ

احمد حسین قریشی، قلعداری		اقبال معاصرین کی نظر میں	اقبال نمبر اکتوبر ۷۳ء، ص ۲۴۲-۲۴۵
احمد ندیم قاسمی		اقبال کی ایک نظم شمع و شاعر	اکتوبر، دسمبر ۸۴ء اقبال نمبر ص ۹۲-۱۰۲
اختر راہی	i	مولانا ظفر علی خان اور علامہ اقبال	نومبر، دسمبر ۷۷ء اقبال نمبر ص ۱۵۹-۱۶۸
	ii	ڈاکٹر اقبال اور مولانا انور شاہ کاشمیری	اکتوبر ۷۳ء، اقبال نمبر ص ۲۸۱-۲۸۶
ارشاد احمد ارشد		تضمینات اقبال	اکتوبر ۶۱ء شمارہ ۷، ص ۴۰-۶۸
اسلوب احمد انصاری، پروفیسر		اقبال کے ہاں حرکی پیکر	اکتوبر، دسمبر ۸۲ء اقبال نمبر ص ۶۲-۷۴
اسد ادیب، ڈاکٹر		شعری نہارتوں کا شاعر اقبال	جولائی-اگست ۸۷ء، ص ۲۶-۳۷
افتخار احمد صدیقی	i	اقبال کا تصورِ زمان و مکان (تبصرہ)	جنوری، فروری ۶۷ء، ص ۹۱-۹۶
	ii	اقبال کا تحقیقی مطالعہ؛ فلسفہ و عجم	نومبر، دسمبر ۷۷ء اقبال نمبر ص ۱۱-۳۲
افضل حق قرشی، قاضی	i	علامہ اقبال کی غیر مدون تحریریں	جنوری ۷۱ء، ص ۷۷-۹۳
"	ii	نادرات اقبال (غیر مدون تحریریں)	اکتوبر ۷۳ء اقبال نمبر ص ۱۹۷-۲۳۷
اکبر علی خان	i	گنج بادآورد (نوادراتِ اقبال)	شمارہ ۱۱، ص ۲۱-۳۷

	زز	نوادرات اقبال	شمارہ ۹ ، ص ۲۴ - ۳۲
امجد اسلام امجد		اقبال کی شعری لسانیات	نومبر/دسمبر ۷۷، اقبال نمبر ص ۱۱۴ - ۱۲۸
انتظار حسین		اقبال اور بعض دوسرے شاعر (تبصرہ)	جولائی/اگست ۷۸، ص ۱۰۲
انور سدید		اقبال کے کلاسیکی نقوش	جولائی/اکتوبر ۷۷، ص ۲۲۷ - ۲۵۰ اقبال نمبر
انور محمود خالد		قائد اعظم علامہ اقبال کی نظر میں	قائد اعظم نمبر ستمبر/دسمبر ۷۶، ص ۱۲۰ - ۱۶۸
انیس ناگی		اقبال انحراف کا شاعر	جولائی/اکتوبر ۷۷، ص ۱۳۲ - ۱۳۷ اقبال نمبر
ایس اے رحمٰن، جسٹس	ز	اقبال اور مسئلہ ارتقا	اکتوبر ۷۳، اقبال نمبر ص ۲۵۳ - ۲۸۰
	زز	اقبال کی شخصیت اور شاعری پر ایک نظر۔	مارچ/اپریل ۷۶، ص ۱ - ۶
بشیر احمد ڈار		اقبال کے چند نادر خطوط	نومبر/دسمبر ۷۷، اقبال نمبر، ص ۱ - ۱۰
تحسین سروری		اقبال کی دو نظمیں اور ان کا پس منظر	اکتوبر ۷۳، اقبال نمبر ص ۶۱ - ۷۱
جابر علی سید	ز	کلام اقبال میں صناعی کے عناصر	اکتوبر/دسمبر ۸۲، اقبال نمبر ص ۸۳ - ۹۸
	زز	اقبال کے ایک مصرعے کی تشریح	جولائی/اکتوبر ۷۷، اقبال نمبر ص ۱۲۱ - ۱۲۴
جگن ناتھ آزاد		اقبال اور برگساں کا ذہنی قرب و بعد	جولائی/اکتوبر ۷۷، اقبال نمبر ص ۱۱۳ - ۱۲۰
جمیل جالبی، ڈاکٹر		مطالعہ اقبال کے نئے گوشے	اکتوبر/دسمبر ۸۲، اقبال نمبر ص ۳۸ - ۴۳
جمیل یوسف		فکر اقبال کا ماخذ	نومبر/دسمبر ۷۷، اقبال نمبر ص ۱۶۹ - ۱۸۰
جیلانی کامران، پروفیسر		فکر اقبال اور مذہبی تجربہ	اکتوبر/دسمبر ۸۲، ص ۷۵، ۸۲
حامد علی خان		سر اقبال دے نال میل	جولائی/اکتوبر ۷۷، اقبال نمبر ص ۹۰ - ۹۵
درشہوار ابراہیم		اقبال کا فلسفہ حرکت و عمل اور اس کے محرکات	مارچ/اپریل ۷۸، ص ۴۹ - ۶۴
رحیم بخش شاہین		شیخ نور محمد: پدر و مرشد اقبال	جولائی/اکتوبر ۷۷، اقبال نمبر ص ۲۵۱ - ۲۶۵
رفیع الدین ہاشمی	ز	کتابیات اقبال	اکتوبر ۷۳، اقبال نمبر ص ۳۲۷ - ۳۵۸
	زز	اقبال کے پانچ غیر مدون خطوط	نومبر/دسمبر ۷۷، اقبال نمبر ص ۱۲۹ - ۱۳۷

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved ©2002-2006

	iii	A Study of Iqbal's Philosophy. (تبصرہ) مرتبہ بشیر احمد ڈار	جنوری ۱۹۷۳ء ص ۱۶۴ - ۱۶۸
ریاض احمد شاد		اقبال کے پنجابی تراجم	جولائی/اکتوبر ۷۷ء اقبال نمبر ص ۱۷۶-۱۹۴
ریاض صدیقی		اقبال اور مسلم	نومبر/دسمبر ۷۷ء اقبال نمبر ص ۱۸۱-۱۹۰
ذکریا، خواجہ، ڈاکٹر		معاصرین اقبال کی نظر میں۔ مرتبہ عبداللہ قریشی (تبصرہ)	نومبر/دسمبر ۷۸ء ص ۸۸ - ۹۰
سجاد رضوی		شعر اقبال از عابد علی عابد (تبصرہ)	شمارہ ۱۲ ص ۱۴۶
سراج منیر		فکر اقبال، پس منظر و پیش منظر	نومبر/دسمبر ۷۷ء اقبال نمبر ص ۱۵۲-۱۵۸
سعادت سعید		اقبالیات ایک جائزہ	اکتوبر/دسمبر ۸۵ ص ۹۳ - ۱۰۴
سلیم اختر، ڈاکٹر	i	تو شب آفریدی چراغ آفریدم	جولائی/اکتوبر ۷۷ء اقبال نمبر ص ۱۳۸-۱۵۳
	ii	علامہ اقبال کی رباعیات	اکتوبر/دسمبر ۸۲ء اقبال نمبر ص ۹۹ - ۱۰۹
سمیع اللہ قریشی		خطبات اقبال کا پس منظر	جنوری ۸۴ء اقبال نمبر ص ۲۲ - ۳۳
شاہین ملک		اقبال ایک نقاد	اکتوبر/دسمبر ۸۴ء اقبال نمبر ص ۱۵ - ۲۷
شریف کنجاہی (پروفیسر)	i	خفتگان خاک سے استفسار	جولائی/اکتوبر ۷۷ء اقبال نمبر ص ۸۲ - ۸۹
	ii	اقبال کی دعائیں	اکتوبر/دسمبر ۸۲ء اقبال نمبر ص ۲۳ - ۲۹
	iii	اقبال کی بچوں کی نظمیں	مارچ/اپریل ۸۷ء، ص ۱ - ۷
صابر کلوروی		مکاتیب اقبال کے ماخذ - (چند مزید حقائق)	جنوری/مارچ ۸۴ء ص ۲۵-۳۸
صدیق جاوید	i	علامہ اقبال، مستشرقین اور آرنلڈ	جنوری/مارچ ۸۲ء، ص ۳۶-۵۳
	ii	اقبال یورپ میں؛ چند تاریخی مغالطے	جولائی/اکتوبر ۷۷ء اقبال نمبر ص ۲۷۶-۳۰۵
صفدر محمود		علامہ اقبال کا گوشوارہ آمدنی	اکتوبر ۷۳ء اقبال نمبر ص ۱۳ - ۵۱
طٰہٰ حسین، ڈاکٹر		اقبال (ترجمہ خورشید رضوی)	نومبر/دسمبر ۷۷ء اقبال نمبر ص ۸۱ - ۹۰
ظہیر فتح پوری، ڈاکٹر		اقبال کی اردو غزل	مئی/جون ۷۹ ص ۱ - ۵
عابد علی عابد		مقامات اقبال پر تبصرہ	شمارہ ۱۱، ص ۱۵۹ - ۱۶۰
"		فکر اقبال (تبصرہ)	ستمبر ۵۷ء، ص ۲۵۶ - ۲۵۷
عبداللہ، ڈاکٹر، سید	i	اقبال کی شخصیت اور شاعری (تبصرہ)	نومبر/دسمبر ۷۷ء اقبال نمبر ص ۱۹۱

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved ©2002-2006

	ii	اقبال کے غیر مسلم مداح اور نقاد	جولائی/اکتوبر ۷۷، اقبال نمبر ص ۱-۱۹
	iii	اقبال کے کچھ غیر ملکی مداح	اکتوبر/دسمبر ۸۲، اقبال نمبر ص ۱-۱۷
	iv	اقبال کے نظریہ علم کے چند پہلو	جنوری ۸۴، اقبال نمبر ص ۱-۱۳
	v	اقبال اور دانتے کے ذہنی فاصلے	جنوری/فروری ۸۷، ص ۱-۶
	vi	اقبال اور حافظ کے ذہنی فاصلے	شمارہ ۲ ص ۹-۲۳
محمد عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر	i	لاہور میں علامہ اقبال کی قیام گاہیں	اکتوبر ۷۳، اقبال نمبر ص ۵۲-۶۰
	ii	اقبال کا نظریہ فن تعمیر کے بارے میں	نومبر/دسمبر ۷۷، اقبال نمبر ص ۳۰-۴۸
عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر		اقبال مستقبل شناس سیاستدان کی حیثیت سے	جنوری ۷۸، اقبال نمبر ص ۱۴-۲۱
عبدالعزیز کمال		اقبال اور جدید علم کلام	اکتوبر/دسمبر ۸۴، اقبال نمبر ص ۱۱۰-۱۳۱
عبدالغنی ڈاکٹر	i	علامہ اقبال مزار بابر پر	نومبر/دسمبر ۷۷، اقبال نمبر ص ۲۳-۲۹
	ii	علامہ اقبال کی تصنیف: ایک قطعہ تاریخ	مارچ/اپریل ۷۷، ص ۲۰-۳۰
عبدالواحد معینی		اقبال اور رومی	جنوری ۷۸، اقبال نمبر ص ۳۴-۴۰
عشرت رحمانی		گلشن راز جدید (ایک سرسری جائزہ)	جولائی/اکتوبر ۷۷، اقبال نمبر ص ۱۲۵-۱۳۱
علی عباس، پروفیسر سید		مکاتیب علامہ اقبال بنام قائد اعظم کا پس منظر اور اساس پاکستان	نومبر/دسمبر ۷۷، اقبال نمبر ص ۴۹-۶۰
عندلیب شادانی		اقبال اور مسئلہ جبر و قدر	دس سالہ قومی ترقی نمبر۔ اکتوبر ۶۸، ص ۱۴۴-۱۴۹
غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر		اقبال کے ایک پیرو مرشد اکبر الہ آبادی	اکتوبر/دسمبر ۸۵، اقبال نمبر ص ۱-۷
فتح محمد ملک، پروفیسر		سوویت یونین میں اقبال شناسی	نومبر/دسمبر ۷۷، اقبال نمبر ص ۷۵-۸۰
فرحت شاہجہان پوری	i	خوشحال و اقبال (تبصرہ)	جنوری ۶۲، ص ۱۳۲
	ii	″	شمارہ ۲۰، ص ۱۰۲-۱۲۰
فرمان فتح پوری		تنگنائے غزل (وسعت بیان اور اقبال)	مارچ/اپریل ۸۷، ص ۳۱-۴۸
فیاض محمود، سید		استفسار	جولائی/اکتوبر ۷۷، اقبال نمبر ص ۵۵-۵۹
کلب علی خان فائق	i	قاموس الاقبال جلد اول و دوم مرتبہ عبدالجبار شاکر (تبصرہ)	جنوری/مارچ ۸۲، ص ۹۱
	ii	اقبال اور احساس مذہب	اکتوبر/دسمبر ۸۲، اقبال نمبر ص ۳۴-۳۷

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved ©2002-2006

	iii	اقبال کی شاعری کا آغاز	جولائی/اکتوبر ۷۷ء اقبال نمبر ص ۳۰۶ - ۳۱۱
	iv	علامہ اقبال کی ولادت کا صحیح سنہ	اکتوبر/دسمبر ۸۲ء اقبال نمبر ص ۱۴۸ - ۱۵۴
کلیم اختر		علامہ اقبال کا سفرِ کشمیر	جولائی/اگست ۷۸ء ص ۴۷ - ۵۶
محمد اسلم ضیاء		اقبال کے کلام کا عروضی تجزیہ	مئی/جون ۷۹ء ص ۴۲ - ۴۷
محمد اکرم، سید		عصر اقبال کا سیاسی پس منظر	شمارہ ۵، اکتوبر ۷۱ء ص ۵۰ - ۶۵
محمد باقر، ڈاکٹر	i	اقبال کے اجداد کا سلسلہ عالیہ	اکتوبر ۷۳ء اقبال نمبر ص ۱ - ۱۲
	ii	ارمغان حجاز (سندھی ترجمہ) از لطف اللہ بدوی - (تبصرہ)	جنوری ۷۳ء، ص ۹۳
محمد حنیف شاہد	i	سر ہو گئے اقبال	نومبر/دسمبر ۷۷ء اقبال نمبر ص ۱۳۸ - ۱۵۱
	ii	علامہ اقبال کی پانچ غیر مدون تحریریں	اکتوبر ۷۳ء اقبال نمبر ص ۲۳۸ تا ۲۴۱
محمد حیات خان سیال		اقبال اور فکر مغرب	اقبال نمبر اکتوبر/دسمبر ۸۲ء ص ۱۸ - ۲۲
محمد رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر		اقبال کے نظام فکر میں سائنس کا مقام	جولائی/اکتوبر ۷۷ء اقبال نمبر ص ۱۷ - ۲۸
محمد شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر	i	جمہوریت اقبال کی نظر میں	" " " " ص ۴۳ - ۵۴
	ii	اقبال کا تصورِ کائنات	اکتوبر ۷۳ء اقبال نمبر ص ۲۴۶ - ۲۵۲
محمد صدیق		علامہ اقبال کے ذاتی کتب خانے میں چند قانونی کتابیں۔	مارچ/اپریل ۷۹ء ص ۳۰ - ۴۸
محمد عبداللہ قریشی	i	حیاتِ جاوداں	اکتوبر/دسمبر ۸۲ء اقبال نمبر ص ۱ - ۱۴
	ii	اقبال کی باتیں اور ملاقاتیں	" " ۸۲ء اقبال نمبر ص ۴۴ - ۶۱
	iii	نوادرِ اقبال (غیر مطبوعہ خطوط)	اکتوبر ۷۳ء اقبال نمبر ص ۷۲ - ۱۸۸
	iv	حیاتِ جاوداں	جنوری/مارچ ۱۹۸۵ء، ص ۱۳ - ۲۷
	v	آفتابِ اقبال	اکتوبر/دسمبر ۸۵ء اقبال نمبر ص ۱۸ - ۴۲
	vi	حیاتِ جاوداں (علامہ کی تاریخ گوئی)	مئی/جون ۸۷ء ص ۵۴ - ۶۴
	vii	داستان از دکن آوردہ ام	جولائی/اکتوبر ۷۷ء اقبال نمبر ص ۶۶ - ۸۱
	viii	حیاتِ جاوداں	مارچ/اپریل ۸۷ء، ص ۸ - ۳۰
محمد عثمان، پروفیسر		کیا مذہب ممکن ہے؟	جنوری ۷۴ء، اقبال نمبر ص ۴۲ - ۵۹
محمد منور، پروفیسر		علامہ اقبال کی فارسی غزل	" " " ص ۶۰ - ۱۳۹

	ii	علامہ اقبال بحضور قرآن	نومبر/دسمبر ۷۴ء اقبال نمبر ص ۶۱-۷۴
	iii	علامہ اقبال کا شعری آہنگ اور ضرب کلیم	اکتوبر/دسمبر ۷۳ء اقبال نمبر ص ۱۳۲-۱۴۷
محمود احمد ناظر		پلگریمیج آف ایٹرنٹی۔ منظوم انگریزی ترجمہ جاوید نامہ از شیخ محمود احمد (تبصرہ)	جنوری ۶۳ء ص ۱۱۵-۱۱۹
مظفر حسن ملک		اقبال: فکر و عمل کا اتحاد	جولائی/ستمبر ۸۴ء آزادی نمبر ص ۳۲-۵۹
معین الدین عقیل، ڈاکٹر	i	سید جمال الدین افغانی اور اقبال	جولائی/اکتوبر ۷۷ء اقبال نمبر ص ۱۹۵-۲۲۶
	ii	دنیائے اسلام میں وطنی قومیت کا مسئلہ اور اقبال	مارچ/جون ۸۳ء ص ۱۵-۱۷
ممتاز حسن، ڈاکٹر		قارئین اقبال کے لیے گوئٹے کی اہمیت	جنوری ۷۴ء اقبال نمبر ص ۱۴۰-۱۴۵
ممتاز منگلوری		اندلس۔ کلام اقبال کے آئینے میں	اکتوبر ۷۳ء اقبال نمبر ص ۲۰۷-۲۲۹
منظور حسین خواجہ		علامہ اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط	اکتوبر ۷۳ء اقبال نمبر ص ۱۸۹
میرزا ادیب	i	خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی (تبصرہ)	مئی/جون ۷۷ء ص ۹۶-۹۸
	ii	علامہ اقبال کی ایک شگوفۂ نثر	جولائی/اکتوبر ۷۷ء اقبال نمبر ص ۹۰-۱۱۲
نامعلوم	i	Letters and Writings of Iqbal. تالیف بشیر احمد ڈار (تبصرہ نامعلوم)	جولائی ۶۲ء ص ۱۵۰
	ii	نقش اقبال، مرتبہ سید عبدالواحد معینی (تبصرہ)	اپریل ۷۰ء ص ۱۶۳
	iii	مطالعات اقبال مرتبہ اسلم ملک (تبصرہ)	" " ص ۱۶۳
	iv	مکاتیب بنام گرامی مرتبہ عبداللہ قریشی (تبصرہ)	جنوری ۷۰ء ص ۱۳۶-۱۳۸
	v	علامہ اقبال بھوپال میں مرتبہ عبدالقوی دسنوی (تبصرہ)	" " ص ۱۶۷-۱۶۸
	vi	گفتار اقبال: مرتبہ محمد رفیق افضل (تبصرہ)	اپریل ۷۰ء ص ۱۹۰
	vii	اردو شاعری پر افکار اقبال کے اثرات۔	جنوری/مارچ ۸۵ء ص ۱-۱۳

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
2002-2006

نور محمد قادری، سید		سید نذیر نیازی کی ایک نادر تحریر	اکتوبر/دسمبر ۸۲ء اقبال نمبر ص ۳۰-۳۳
وارث سرہندی		انوارِ اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار (تبصرہ)	جنوری، ۷۰ء ص ۱۲۵-۱۲۶
وحید قریشی، ڈاکٹر	i	آثارِ اقبال	اکتوبر ۷۳ء اقبال نمبر ص ۱۹۰-۱۹۶
	ii	اقبال اور چغتائی	جولائی/اکتوبر ۷۷ء اقبال نمبر ص ۲۹-۴۲

IQBAL ACADEMY PAKISTAN Library LAHORE 41304
www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006